قرآن وسنت اور اسلاف امت کی تعلیمات کا داعی
دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ صدائے حق بنگلور

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری زیدت معالیھم
استاذ حدیث و مدیر ماہنامہ دار العلوم دیوبند

نائب مدیر	مدیر
مفتی عبد الرحمٰن بنگلوری	عبد الرزاق بنگلوری

ناشر
مجلس، صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور-78

قرآن وسنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا داعی
دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ

صدائے حق بنگلور

ماہ محرم ۱۴۴۶ھ	ماہ جولائی ۲۰۲۴ء	شمارہ:۱	جلد:۰۵

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم
استاذِ حدیث و مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر	نائب مدیر
عبدالرزاق بنگلوری	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری

مجلس ادارت

مفتی محمد علی صاحب قاسمی
مولانا محمد اُویس صاحب رشادی
مولانا عبداللطیف صاحب قاسمی

مجلسِ مشاورت

مولانا اشرف صاحب قاسمی
مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری
مفتی عبدالفتاح صاحب قاسمی

ADVERTISEMENT TARIFF

Full Page (Title Back Cover)	6000/-
Full Page (Title Inner Cover)	5000/-

Black and White

Full Page (Inside Pages)	2000/-
Half Page (Inside Pages)	1000/-
Cuarter Page (Inside Pages)	500/-

Phone Pe & Google Pay:7406464533

مضمون نگار کی آرا سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

شائع کردہ

مجلس: صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور 78

فہرست

عناوین	مضامین	اسمائے محررین	صفحہ نمبر
اداریہ	قضیۂ فلسطین مثبت اور منفی پہلو	عبدالرزاق بنگلوری	۳
درسِ حدیث	جنت میں داخل کرنے والے اعمال	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری	۸
تذکرۂ صحابہؓ	خاندانِ نبوت کے چشم و چراغ حضرت عبداللہ ابنِ جعفرؓ اور...	مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی	۱۴
اصلاحِ معاشرہ	نا قابلِ معافی گناہ	مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی	۲۰
// // //	یتیموں کی خبر گیری کرنا (قسط دوم)	مفتی محمد عفان صاحب منصور پوری	۲۴
// // //	اچھے اخلاق اپنائیں، بُرے اخلاق سے بچیں	مولانا عمرین محفوظ رحمانی صاحب	۳۰
// // //	اساتذہ اور علما ماسوائے رب سے مستغنی رہیں	مفتی احمد اللہ نثار صاحب قاسمی	۳۲
// // //	بدگمانی کے دینی و دنیاوی نقصانات	مولوی عبداللہ سلّمہٗ مہاراسٹر	۴۶
// // //	عقیدہ کی اہمیت اور تحفظ	مولوی عمر فاروق سلّمہٗ فتح پوری	۴۸

اطلاعِ عام

نوٹ: مضمون نگار اپنے مضامین مندرجہ ذیل ای میل (E-mail) یا واٹسیپ (WhatsApp) پر ان پیج (InPage) فائل روانہ کر سکتے ہیں، جزاکم اللہ خیراً و أحسن الجزاء.

Email: muftiabdurrahman57@gmail.com
Whatsapp No: 09620795460 - 9739349433

ادار یہ

قضیۂ فلسطین مثبت اور منفی پہلو

از:مفتی عبدالرزاق بنگلوری

اِس وقت پوری دنیا میں ایک ہی موضوع زیرِ بحث ہے اور وہ ہے مسئلۂ فلسطین۔ اور فلسطین عوام ہی نہیں؛ بلکہ پوری دنیا پریشان ہے کہ یہ قضیہ مزید کتنی جانیں لے گا اور یہ خطہ مزید کتنی دیر تک چند ایک لوگوں کی خواہشات کی نذر رہوتا رہے گا؟!

میں کافی تحقیق کے بعد اِس جاری جنگ کے حقائق، ماضی، حال، مستقل اور فلسطین واسرائیل وار کی تاریخ، اس جنگ میں اپنوں اور بیگانوں کا کردار اور بے شمار چھپے ہوئے پہلوؤں کی عقدہ کشائی کرنے جارہا ہوں؛ تاکہ ایک مکمل منظر نامہ اس حوالے سے آپ کی نظر میں ہو اور آپ کے علم میں ہو کہ فلسطین کے قضیے کو لے کر پچھلی کئی دہائیوں سے کیا چلتا رہا؟! تاکہ موجودہ صورتِ حال سمجھنے اور اس کا نتیجہ نکالنے میں آسانی ہو۔

فلسطین دنیا کے قدیم ترین ممالک میں سے ایک ہے، یہ اُس علاقہ کا نام ہے جو لبنان اور مصر کے درمیان تھا، جس کے بیشتر حصے پر اب اسرائیل کی ریاست قائم کی گئی ہے۔ ۱۹۴۸ء سے پہلے یہ تمام علاقہ فلسطین کہلاتا تھا۔ جو خلافتِ عثمانیہ میں قائم رہا؛ مگر بعد میں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اس پر قبضہ کرلیا۔ ۱۹۴۸ء میں یہاں کے بیشتر علاقے پر اسرائیل ریاست قائم کی گئی۔ اس کا دارالحکومت بیت المقدس تھا، جس پر ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے قبضہ کرلیا۔ بیت المقدس کو اسرائیلی یروشلم کہتے ہیں اور یہ شہر یہودیوں، مسیحیوں اور مسلمانوں تینوں کے نزدیک مقدس ہے۔ مسلمانوں کا قبلۂ اوّل یہیں ہے۔ فلسطین کی آزادی کی جدوجہد بہت پُرانی ہے۔ دنیا کی ہر زبان کے ادب میں اس پر کتابیں تخلیق ہوئی ہیں، اُردو ادب میں بھی علامہ اقبال، فیض احمد فیض، ظفر علی خاں، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، انتظار حسین اور نعیم صدیقی وغیرہ نے عمدہ ادب تخلیق کیا ہے۔ اِس سلسلے میں مزید معلومات کے لیے آصف فرخی کی مرتبہ ''دنیازاد کا عاشق من الفلسطین نمبر'' اور محمد افتخار شفیع کی کتاب ''اُردو ادب اور آزادیٔ فلسطین''، دیکھی جاسکتی ہے۔

اِن علاقوں میں عبرانی قومیت (Hebrews) کے لوگوں کی آمد کا نشانِ ولادت مسیح سے لگ بھگ ۱۱۰۰ رسال قبل میں ملتا ہے۔ حضرت سیموئیل جو اللہ کے نبی تھے، پہلے اسرائیلی بادشاہ تھے، انھوں نے کافی عرصہ

حکومت کی اور جب وہ بوڑھے ہوگئے تو انھوں نے اللہ کے حکم سے حضرت طالوت علیہ السلام کو بادشاہ مقرر کیا۔ اِس واقعہ کا ذکر قرآنِ مجید کے پارہ دوم میں سورۂ بقرہ کی آیات ۲۴۷ تا ۲۵۲ میں ملتا ہے۔

حضرت طالوت علیہ السلام نے ۱۰۴۰ قبل مسیح سے ۱۰۲۰ قبل مسیح تک حکمرانی کی، اِس دَوران اُنھوں نے جنگ کر کے جالوت (Goliath) کو مغلوب کیا اور اس سے تابوتِ سکینہ واپس لیا جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے تبرکات تھے۔

حضرت طالوت علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام بنیا سرائیل کے بادشاہ بنے، انھوں نے پہلے حبیرون (Hebron) اور پھر بیت المقدس میں اپنا دارالحکومت قائم کیا۔ بیت المقدس دنیا کا قدیم ترین شہر ہے، یہ دنیا کا واحد شہر ہے جو یہودیوں، مسیحیوں اور مسلمانوں کے لیے یکساں مقدس اور محترم ہے، اِس شہر کا موجودہ نام ''یروشلم'' حضرت داؤد علیہ السلام نے رکھا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے ۱۰۰۴ قبل مسیح سے ۹۶۵ ق م تک ۳۳؍سال حکمرانی کی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہا السلام نے ۹۶۵ ق م میں حکومت سنبھالی، جو ۹۲۶ قبل مسیح تک ۳۹؍سال قائم رہی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد اسرائیل کی متحدہ ریاست دو حصوں: سامریہ اور یہودیہ میں تقسیم ہوگئی، دونوں ریاستیں ایک عرصے تک باہم دست و گریبان رہیں۔

۵۹۸ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بختِ نصر نے حملہ کر کے یروشلم سمیت تمام علاقوں کو فتح کر لیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر بادشاہ اور ہزاروں شہریوں کو گرفتار کر کے بابل میں قید کر دیا۔ ۵۳۹ قبل مسیح میں ایران کے بادشاہ خسرو نے بابل کو فتح کیا اور قیدیوں کو رِہا کر کے لوٹا ہوا مال واپس یروشلم بھیج دیا۔

۳۳۲ قبل مسیح میں یروشلم پر سکندرِ اعظم نے قبضہ کر لیا۔ ۱۶۸ قبل مسیح میں یہاں ایک یہودی بادشاہ کا قیام عمل میں آیا؛ لیکن اگلی صدی میں روما کی سلطنت نے اسے زیرِ نگیں کر لیا۔ ۱۳۵ قبل مسیح اور ۷۰ قبل مسیح میں یہودی بغاوتوں کو کچل دیا گیا، اُس زمانے میں اس خطے کا نام ''فلسطین'' پڑ گیا۔

۲۰؍اگست ۶۳۶ء کو عرب فاتحین نے فلسطین کو فتح کر لیا، یہ قبضہ پُر امن طریقہ سے عمل میں آیا۔ ۴۶۳؍سال تک یہاں عربی زبان اور اسلام کا دَور دَورہ رہا۔ تاہم یہودی ایک اقلیت کی حیثیت سے موجود رہے۔ گیارہویں صدی کے بعد یہ علاقہ غیر عرب سلجوق، مملوک اور عثمانی سلطنتوں کا حصہ رہا۔ ۱۱۸۹ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو فتح کیا اور یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

چار صدیوں تک عثمانیوں کی حکمرانی کے بعد ۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے اس خطے کو اپنی تحویل میں لے لیا اور

اعلان بالفور کے ذریعہ یہودیوں کے لیے ایک قومی ریاست کے قیام کا وعدہ کیا گیا۔

فلسطین کی جانب یہودیوں کی نقلِ مکانی ۱۷ رویں صدی کے اواخر میں شروع ہوگئی۔ ۱۹۳۰ء تک نازی جرمنی کے یہودیوں پر مظالم کی وجہ سے اس میں بہت اضافہ ہوگیا۔ ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء، ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۶ء میں عربوں کی طرف سے یہودیوں کی نقلِ مکانی اور اس علاقے میں آمد کے خلاف پُر تشدد مظاہرے ہوئے؛ لیکن یہ سلسلہ جاری رہا۔

۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد کے ذریعہ فلسطین کو تقسیم کر کے ایک عرب اور ایک اسرائیلی ریاست قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ برطانیہ نے اس علاقے سے ۱۹۴۸ء میں اپنی افواج واپس بلالیں اور ۱۴ رمئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیل کی آزاد حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اس کے ساتھ ہی فلسطین ریاست بھی قائم کر دی جاتی؛ لیکن ایسا نہ ہوا۔ عربوں نے تقسیم کو نامنظور کر دیا اور مصر، اُردن، شام، لبنان، عراق اور سعودی عرب نے نئی اسرائیلی ریاست پر حملہ کر دیا، تاہم وہ اسے ختم کرنے میں ناکام رہے؛ بلکہ اس حملے کی وجہ سے یہودی ریاست کے رقبے میں اور اضافہ ہوگیا۔

۱۹۴۹ء میں اسرائیل نے عربوں کے ساتھ الگ الگ صلح کے معاہدے کیے، اس کے بعد اُردن نے غرب اُردن کے علاقے پر قبضہ کرلیا، جب کہ مصر نے غزہ کی پٹی اپنی تحویل میں لیلی، تاہم ان دونوں عرب ممالک نے فلسطینیوں کو اٹانومی سے محروم رکھا۔

۲۹ راکتوبر ۱۹۵۸ء کو اسرائی لنے صحرائے سینا پر حملہ کر کے اُسے مصر سے چھینلیا۔ اس حملے میں برطانیہ اور فرانس کی حکومتوں نے اسرائیل کا ساتھ دیا۔ ۶ رنومبر کو جنگ بندی عمل میں آئی، عربوں اور اسرائیل کے درمیان ایک عارضی صلح کا معاہدہ اقوامِ متحدہ کی نگرانیمیں ہوا، جو ۱۹ رمئی ۱۹۶۷ء تک قائم رہا، جب مصر کے مطالبے پر اقوامِ متحدہ کے فوجید ستے واپس بلالیے گئے، مصریافواج نے غزہ کی پٹی پر قبضہ کرلیا اور خلیجِ عقبہ میں اسرائیلی جہازوں کی آمد و رفت پر پابندیلگادی۔

۵ رجون ۱۹۶۷ءکو چھ روزہ عرب اسرائیل جنگ شروع ہوگئی، اسرائیلیوں نے غزہ کی پٹی کے علاوہ صحرائے سینا پر قبضہ کرلیا، اس کے علاوہ انھوں نے مشرقی یروشلم کا علاقہ، شام کی گولان کی پہاڑیاں اور غرب اُردن کا علاقہ بھی اپنے قبضہ میں کرلیا۔ ۱۰ رجون کو اقوامِ متحدہ نے جنگ بندی کرادی اور معاہدے پر دستخط ہوگئے۔

۶ راکتوبر ۱۹۷۳ء کو یہودیوں کے مقدس دن ''یومِ کپور'' کے موقع پر مصر اور شامنے اسرائیل پر حملہ کر دیا، اسرائیل نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے شامیوں کو پسپائی پر مجبور کر دیا اور نہر سویز عبور کر کے مصر پر حملہ آور

ہو گیا۔ ۲۴؍اکتوبر ۱۹۷۳ء کو جنگ بندی عمل میں آئی اور اقوامِ متحدہ کیامن فوج نے چارج سنبھال لیا۔ ۱۸؍جنوری ۱۹۷۴ء کو اسرائیل نہر سویز کے مغربی کنارے سے واپس چلا گیا۔

۳؍جولائی ۱۹۷۶ء کو اسرائیلی دستوں نے یوگنڈا میں انٹی بی (Entebe) کے ہوائی اڈے پر یلغار کر کے ۱۰۳؍یرغمالیوں کو آزاد کرالیا، جنھیں عرب اور جرمن شدت پسندوں نے اغوا کر لیا تھا۔

نومبر ۱۹۷۷ء میں مصر کے صدر انور السادات نے اسرائیل کا دَورہ کیا اور ۲۶؍مارچ ۱۹۷۹ء کو مصر اور اسرائیل نے ایک امن معاہدے پر دستخط کر کے ۳۰؍سالہ جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں ممالک میں سفارتی تعلقات قائم ہو گئے۔ (تین سال بعد ۱۹۸۲ء میں اسرائیل نے مصر کو صحرائے سینا کا علاقہ واپس کر دیا۔)

جولائی ۱۹۸۰ء میں اسرائیل نے مشرقی یروشلم سمیت پورے یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت قرار دے دیا۔ ۷؍جون ۱۹۸۱ء کو اسرائیلی جیٹ جہازوں نے بغداد کے قریب عراق کا ایک ایٹمی ری ایکٹر تباہ کر دیا۔ ۶؍جون ۱۹۸۲ء کو اسرائیلی فوج نے پی ایل او کی مرکزیت کو تباہ کرنے کے لیے لبنان پر حملہ کر دیا۔ مغربی بیروت پر اسرائیل کی تباہ کن بمباری کے بعد پی ایل او نے شہر کو خالی کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ اسی سال ۱۴؍ستمبر کو لبنان کے نو منتخب صدر بشیر جمائل کو قتل کر دیا گیا۔

۱۶؍ستمبر ۱۹۸۲ء لبنان کے مسیحی شدت پسندوں نے اسرائیل کی مدد سے دو مہاجر کیمپوں میں گھس کر سینکڑوں فلسطینیوں کو ہلاک کر دیا۔ اس سفاکانہ کارروائی پر اسرائیل کو دنیا بھر میں شدید مذمت کا نشانہ بننا پڑا۔

۱۹۸۹ء میں انتفادہ کے زیرِ اہتمام فلسطین حریت پسندوں نے زبردست عسکری کارروائی کا آغاز کیا۔ ۱۹۹۱ء کے آغاز میں جنگِ خلیج کے دَوران عراق نے اسرائیل کو کئی سکڈ میزائلوں کا نشانہ بنایا۔

موجودہ صورتِ حال:

مشرقی بیت المقدس، غزہ کی پٹی اور غربِ اُردن میں رہنے والے اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے درمیان تناوَ ہمیشہ ہی رہتا ہے۔

غزہ میں فلسطین عسکریت پسند گروہ ''حماس'' برسرِ اقتدار ہے، جس نے اسرائیل سے کئی مرتبہ جنگ کی ہے۔ اسرائیل اور مصر سختی سے غزہ کی سرحدوں کی نگرانی کرتے ہیں؛ تاکہ حماس تک ہتھیار نہ پہنچیں۔

غزہ اور غربِ اُردن میں رہنے والے فلسطینیوں کا کہنا ہے کہ اسرائیلی پابندیاں اور کارروائیاں ان کی مشکلات میں اضافہ کرتی ہیں۔ اسرائیل کہتا ہے کہ وہ تو صرف خود کو فلسطینی تشدد سے بچا رہے ہیں۔

رَواں برس ماہِ رمضان کے آغاز سے ہی یہاں صورتِ حال کافی کشیدہ ہے۔

متعدد فلسطینی خاندانیوں کو مشرقی بیت المقدس میں ان کے گھروں سے بے دخل کیے جانے کے بعد سے فلسطینیوں میں شدید غم وغصہ پایا جاتا ہے۔

مرکزی مسائل کیا ہیں؟

ایسے متعدد معاملات ہیں جن پر فلسطین اور اسرائیل اتفاق نہیں کر سکتے۔

اُن میں یہ سوالات ہیں: فلسطین پناہ گزینوں کا کیا ہوگا؟ غربِ اُردن میں یہودی بستیاں رہیں گی یا نہیں؟ کیا دونوں فریق بیت المقدس میں اکٹھے رہ سکتے ہیں؟ اور شاید سب سے مشکل یہ کہ کیا اسرائیل کے ساتھ ایک فلسطینی ریاست بنی چاہیے۔

گذشتہ ۲۵ رسالوں میں امن مذاکرات وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں؛ مگر معاملات حل نہیں ہو سکے۔

اسرائیل آج بھی غربِ اُردن پر قابض ہے، تاہم اُس نے غزہ کی پٹی سے فوجیں نکال لی ہیں؛ مگر اقوامِ متحدہ آج بھی اس علاقے کو مقبوضہ مانتا ہے۔

اسرائیل پورے بیت المقدس کو اپنا دارالخلافہ مانتا ہے، جب کہ فلسطین مشرقی بیت المقدس کو مستقبل کی فلسطین ریاست کا دارالحکومت مانتے ہیں۔ امریکہ اُن چند ممالک میں سے ایک ہے جو اسرائیلی دعوے کو تسلیم کرتا ہے۔

گذشتہ ۵۰ رسالوں میں اسرائیل نے یہاں آبادیاں بنالی ہیں جہاں چھ لاکھ یہودی رہتے ہیں۔

فلسطینیوں کا کہنا ہے کہ یہ بین الاقوامی قوانین کے مطابق غیر قانونی ہے اور امن کی راہ میں رکاوٹ ہیں، جب کہ اسرائیل اسے مسترد کرتا ہے۔ یہی مسئلہ آج بھی ان کے درمیان گشت کر رہا ہے، جس کے تئیں یہ صورتِ حال ۲۰۲۴ء میں بھی موجود ہے۔

❑❖❑

درسِ حدیث

جنت میں داخل کرنے والے اعمال

ازقلم: مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری، ناظم مدرسہ دارالتوحید، اعلیٰ ہلی بنگلور

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ''يَاأَيُّهَا النَّاسُ أَفْشُوا السَّلَامُ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصَلُّوْا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ''. (سنن ابن ماجة: ٢٣٤)

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ (سب سے پہلے جو) آپؐ نے ارشاد فرمایا وہ یہ ہے کہ: ''اے لوگو! سلام کو پھیلایا کرو اور عام وخاص ہر طرح کے لوگوں کو کھانا کھلایا کرو اور عزیز واقارب رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کیا کرو اور اُس حالت میں نماز پڑھا کرو جب لوگ خوابِ غفلت میں سو رہے ہوں، تو تم سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے''۔

تشریح:

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو ایک بہت بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، اسلام سے پہلے یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے، وہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت سیّد الکونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو مدینہ کے گلی کوچوں اور ہر طرف آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد کا چرچا اور شہرت ہوگئی اور ہر طرف سے جوق در جوق لوگ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھنے کے لیے سیلاب کی طرح آنے لگے، میں بھی آپؐ کو دیکھنے کے لیے پہنچ گیا اور آپؐ کو دیکھتے ہی میرا تأثر یہ رہا کہ آپؐ کا چہرہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہو سکتا، ایسا چہرہ اللہ کے سچے رسول ہی کا چہرہ ہو سکتا ہے، آپؐ نے لوگوں سے سب سے پہلے جو وعظ فرمایا اُس میں چار چیزیں خاص طور سے ذکر فرمائی ہیں:

(۱) أَفْشُوا السَّلَامَ (سلام کو خوب پھیلاؤ): جو بھی سامنے آجائے اُس کو السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ کہا کرو، چاہے تم اُس آدمی کو جانتے ہو یا اَنجان آدمی ہی کیوں نہ ہو، ہر ایک کو سلام کیا کرو، اِس سے آپس میں تعلق اور محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اِسی طرح ایک جگہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا۝﴾.

(سورۂ نساء، پ:٥، رقم الآیة:٨٦، رکوع:١١)

اور جب تم کو دعا دیوے کوئی تو تم بھی دعا دو اُس سے بہتر یا وہی کہو اُلٹ کر، بیشک اللہ ہے ہر چیز کا حساب کرنے والا۔

(شیخ الہندؒ)

تشریح:

یعنی کسی مسلمان کو سلام کرنا یا دعا دینا درحقیقت اللہ سے اُس کی شفاعت کرنا ہے، تو حق تعالیٰ شفاعتِ حسنہ کی ایک خاص صورت کو جو مسلمانوں میں شائع ہے صراحت کے ساتھ بیان فرماتا ہے کہ جب کوئی اے مسلمانو تم کو دعا دے یا سلام کرے تو تم کو بھی اُس کا جواب دینا ضرور چاہیے، یا تو وہی کلمہ تم بھی اُس کو کہو، یا اُس سے بہتر، مثلاً: اگر کسی نے کہا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ تو واجب ہے تم پر کہ اُس کے جواب میں ”وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ“ کہو اور زیادہ ثواب چاہو تو ”ورحمۃ اللّٰہ“ بھی بڑھا دو اور اگر اُس نے یہ لفظ بڑھایا ہو تو تم ”وَبَرَکَاتُہٗ“ زیادہ کرو، اللہ کے یہاں ہر ہر چیز کا حساب ہوگا اور اُس کی جزا ملے گی، سلام اور اُس کا جواب بھی اس میں آ گیا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! آپؐ نے (جواب میں) فرمایا: وَعَلَیْکَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ، پھر دوسرا شخص آیا، اُس نے کہا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ آپؐ نے جواب میں فرمایا: وَعَلَیْکَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ پھر ایک اور صاحب آئے، اُنہوں نے کہا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ آپؐ نے جواب میں فرمایا: عَلَیْکَ تو اُس نے کہا: اے اللہ کے نبیؐ! فلاں اور فلاں نے آپ کو سلام کیا تو آپؐ نے جواب کچھ زیادتی کے ساتھ دیا، جو مجھے نہیں دیا، آپؐ نے فرمایا: تم نے ہمارے لیے کچھ باقی ہی نہ چھوڑا، فرمانِ خدا ہے: جب تم پر سلام کیا جائے تو تم اُس سے اچھا جواب دو یا اُسی کو لوٹا دو؛ اِس لیے ہم نے وہی الفاظ لوٹا دیے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور السلام علیکم یا رسول اللہ! کہہ کر بیٹھ گئے، آپؐ نے جواب دیا اور فرمایا دس نیکیاں ملیں، دوسرے آئے اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ یا رسول اللہ! کہہ کر بیٹھ گئے، آپؐ نے فرمایا بیس نیکیاں ملیں، پھر تیسرے صاحب آئے، انہوں نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ آپؐ نے فرمایا تیس نیکیاں ملیں۔

(۲) وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ (لوگوں کو کھانا کھلایا کرو): آنے جانے والے مہمانوں اور غریبوں وضرورت مندوں کو اور اپنوں و پرایوں کو کھانا کھلایا کرو۔ مہمان داری ایسی خوش نصیبی ہے کہ جس کے یہاں مہمانداری کا سلسلہ جاری ہے اُس کے یہاں کبھی فقر وفاقہ کی مصیبت نہیں آتی ہے اور دنیا اُسے یاد کرتی رہتی ہے۔ اِس سلسلہ کی چند آیات ترجمہ اور تشریح کے ساتھ استفادہ کی غرض سے پیشِ خدمت ہے:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ وَمَاتُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝﴾.
(سورۂ آلِ عمران، پ:٤، رقم الآیۃ:٩٢، رکوع:١٠)

ہرگز نہ حاصل کرسکوگے نیکی میں کمال جب تک نہ خرچ کرو اپنی پیاری چیز سے کچھ اور جو چیز خرچ کروگے سواللہ کو معلوم ہے۔ (شیخ الہندؒ)

تشریح:

یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ کیسی چیز خرچ کی، کہاں خرچ کی اور کس کے لیے خرچ کی۔ جتنی محبوب اور پیاری چیز جس طرح کے مصرف میں جس قدر اخلاص وحسنِ نیت سے خرچ کروگے اُسی کے موافق خداتعالیٰ کے یہاں سے بدلہ ملنے کی اُمید رکھو، اعلیٰ درجہ کی نیکی حاصل کرنا چاہو تو اپنی محبوب وعزیز ترین چیزوں میں سے کچھ خدا کے راستہ میں نکالو۔

اور ایک جگہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾.
(سورۂ بقرہ، پ:٢، رقم الآیۃ:١٧٧، رکوع:٢٢)

اور دے مال اُس کی محبت پر رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو۔
(شیخ الہندؒ)

تشریح:

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: افضل صدقہ یہ ہے کہ تو اپنی صحت اور مال کی محبت کی حالت میں اللہ کے نام دے، تجھے مال کی کمی کا اندیشہ ہو اور زیادتی کی رغبت ہو۔

ایک جگہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْكَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۝﴾
(سورۂ حشر، پ:٢٨، رقم الآیۃ:٩، رکوع:١)

اور مقدم رکھتے ہیں اُن کو اپنی جان سے اور اگر چہ ہو اپنے اُوپر فاقہ۔ (شیخ الہندؒ)

تشریح:

یعنی باوجود اپنی حاجت اور ضرورت کے بھی وہ دوسروں کو اپنے نفس پر مقدم کرتے ہیں، یہ لوگ بڑے

پایے کے ہیں؛ کیوں کہ پہلی قسم کے لوگوں نے تو اپنی پسندیدہ چیز باوجود اس کی محبت کے دوسروں کو دی؛ لیکن ان بزرگوں نے اپنی چاہت کی وہ چیز جس کے وہ خود محتاج تھے دوسروں کو دے دی اور اپنی حاجت مندی کا خیال بھی نہ کیا۔

(۳) وَصَلُّوْا وَالنَّاسُ نِيَامٌ (تم اِس حالت میں نماز پڑھا کرو جب لوگ غفلت کی نیند میں سو رہے ہوں) یہ تنہائی کی عبادت ہے، جو اللہ کو بہت پسند ہے۔

فضائلِ تہجد:

اِس ضمن میں کچھ قرآنی آیات مختصر تشریح کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کریں گے ان شاء اللہ!۔ اللہ رب العزت اس سیاہ کار کو عمل کی توفیق بخشے۔ آمین

(۱)-﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾. اور کچھ رات جاگتا رہ قرآن کے ساتھ، یہ زیادتی ہے تیرے لیے۔ (شیخ الہندؒ)

(سورۂ بني کسرائيل، پ:۱۵، رقم الآية:۷۹، رکوع:۹)

تشریح:

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں ’’یعنی‘‘ نیند سے جاگ کر (تہجد میں) قرآن پڑھا کر، یہ حکم سب سے زیادہ تجھ پر کیا ہے کہ تجھ کو مرتبہ (سب سے) بڑا دینا ہے۔

ایک جگہ ارشادِ خداوندی ہے:

(۲)-﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ﴾. وہ مرد کہ نہیں غافل ہوتے سودا کرنے میں اور نہ بیچنے میں اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے سے اور زکاۃ دینے سے۔

(پ:۱۸، سورۂ نور، رقم الآية:۳۷، ر٥٤)

تشریح:

یعنی معاش کے دھندے اُن کو اللہ کی یاد اور احکامِ الٰہیہ کی بجا آوری سے غافل نہیں کرتے، بڑے سے بڑا بیوپار یا معمولی خرید و فروخت کوئی چیز خدا کے ذکر سے نہیں روکتی، صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہی شان تھی۔

(۳)-﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا۝﴾. اور وہ لوگ جو رات کاٹتے ہیں اپنے رب کے آگے سجدہ میں اور کھڑے۔

(پ:۲۹، سورۂ فرقان، رقم الآية:٦٤، رکوع:٦)

تشریح:

یعنی رات کو جب غافل بندے نیند اور آرام کے مزے لوٹتے ہیں، یہ خدا کے آگے کھڑے اور سجدہ میں پڑے ہوئے گزارتے ہیں۔ رکوع چوں کہ قیام وسجود کے درمیان واقع ہے، شاید اِسی لیے اُس کو علیٰحدہ ذکر نہیں کیا، گویا ان ہی دونوں کے بیچ میں آ گیا۔

(۴)-﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۝﴾.
(پ:۲۱، سورۂ سجدہ، رقم الآیة:۱۶، رکوع:۲)

جُدا رہتی ہیں اُن کی کروٹیں اپنے سونے کی جگہ سے (جس طرح راتوں کو تاریکی میں لوگوں سے چھپ کر انہوں نے بے ریا عبادت کی اُس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں چھپا رکھی ہیں اُن کی پوری کیفیت کسی کو معلوم نہیں جس وقت دیکھیں گے آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ حدیث میں ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے جنت میں وہ چیز چھپا رکھی ہے جو نہ آنکھوں نے دیکھی نہ کانوں نے سنی نہ کسی بشر کے دل میں گزری) پکارتے ہیں اپنے رب کو ڈر سے اور لالچ سے (حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''اللہ سے لالچ اور ڈر برا نہیں، دنیا کا ہو یا آخرت اور اِس واسطے بندگی کرے تو قبول ہے، ہاں! اگر کسی اور کے خوف و رجاء سے بندگی کرے تو ریاء ہے، کچھ قبول نہیں)۔

(۵)﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝﴾.

وہ تھے رات کو تھوڑا سونے اور صبح کے وقت میں معافی مانگنے والے۔

(پ:۲۶، سورۂ زاریات، رقم الآیة: ۱۷-۱۸، رکوع:۱)

تشریح:

یعنی رات کا اکثر حصہ عبادتِ الٰہی میں گزارتے اور سحر کے وقت جب رات ختم ہونے کو آتی اللہ سے اپنی تقصیر سے معافی مانگتے کہ الٰہی! حقِّ عبودیت اَدا نہ ہوسکا، جو کوتاہی رہی اپنی رحمت سے معاف فرمادیجیے، کثرتِ عبادت اُن کو مغرور نہ کرتی تھی؛ بلکہ جس قدر بندگی میں ترقی کرتے جاتے خشیت وخوف بڑھتا جاتا تھا۔

(۶)-﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝﴾(پ:۲۹، سورۂ مزمل، رقم الآیة:۶، رکوع:۱)

البتہ اُٹھنا رات کو سخت روندتا ہے اور سیدھی نکلتی ہے بات۔

تشریح:

یعنی رات کو اُٹھنا کچھ آسان کام نہیں، بڑی بھاری ریاضت اور نفس کشی ہے، جس سے نفس روندا جاتا ہے

اور نیند و آرام وغیرہ خواہشات پامال کی جاتی ہیں؛ نیز اُس وقت دعا اور ذکر سیدھا دل سے ادا ہوتا ہے، زبان اور دل موافق ہوتے ہیں، جو بات زبان سے نکلتی ہے ذہن میں خوب جمتی چلی جاتی ہے؛ کیوں کہ ہر قسم کے شور وغل اور چیخ و پکار سے یکسو ہونے اور خداوندِ قدوس کے سماءِ دنیا پر نزول فرمانے سے قلب کو ایک عجیب قسم کے سکون وقرار اور لذت واشتیاق کی کیفیت میسر ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا خوبیوں کو اپنانے سے انسان کا جنت میں داخلہ آسان ہوجاتا ہے، اللہ ربِّ ذوالجلال ہم میں سے ہر ایک میں یہ خوبیاں پیدا فرمائے اور جنت میں داخلہ آسان بنائے۔ آمین

❑❖❑

تذکرۂ صحابہؓ

خاندانِ نبوت کے چشم و چراغ

حضرت عبداللہ ابنِ جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور اُن کی فیاضی

ازقلم: مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی، استاذ مدرسہ عربیہ غیث الہدیٰ بنگلور

آپ کا نام عبداللہ، ابوجعفر کنیت، والدہ اسماء بنتِ عُمیس ہیں، جعفر بن ابی طالب آپ کے والد ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں، اللہ نے اُنہیں اللہ کے راستے میں دو کٹے ہوئے بازوؤں کے بدلے دو پَر عطا فرمائے، جن کے سہارے سے وہ اُڑتے ہیں، جنت میں جہاں چاہتے ہیں جاتے ہیں، آپ کے والدین نے ''حبشہ'' کی طرف ہجرت کی، ''حبشہ'' میں مسلمانوں میں سب سے پہلے پیدا ہونے والے لڑکے آپ ہی ہیں، والد کی شہادت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی تربیت اور کفالت فرمائی۔

(سیر اعلام النبلاء، ترجمہ: ۳۱۵، ۴/۴۵۲)

حضرت عبداللہ بن جعفر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے سات سال کی عمر میں بیعت کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے مسکرا کر استقبال فرمایا اور بیعت فرمائی۔

(سیر اعلام النبلاء، ترجمہ: ۳۱۵، ۴/۴۵۳)

آپ کے والد نے اسلام کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں، ''غزوۂ موتہ'' میں حضرت زید بن حارثہؓ کی شہادت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق اسلامی پرچم بحیثیت امیر آپ نے لیا اور دشمنوں سے لڑتے رہے، جب لڑائی تیز ہوئی، تو گھوڑے سے اُتر گئے اور اس کی اگلی ٹانگیں کاٹ دیں، پیادہ پا لڑنا شروع کیا، اِتنے میں آپ کا داہنا ہاتھ کٹ گیا، آپ نے پرچم بائیں ہاتھ میں لے لیا، پھر بایاں ہاتھ بھی کٹ گیا، آپ نے اسلامی پرچم کو کٹے ہوئے بازوؤں سے جکڑ لیا؛ لیکن پرچم کو گرنے نہ دیا؛ یہاں تک کہ شہادت سے سرخ رو ہوگئے۔ (رواہ الحاکم فی المستدرک، کتاب معرفۃ الصحابۃ، ذکر مناقب جعفر بن ابی طالب: ۴۹۳۷)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جب آپ کو سلام کرتے تو فرماتے:

''**السلام علیک یاابن ذي الجناحین**''. (بخاري، کتاب المغازي، باب غزوة موته: ٤٢٦٤)

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

میرے والد محترم کی شہادت کے تیسرے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لے آئے، فرمایا: آج کے بعد میرے بھائی پر مت روؤ، پھر ارشاد فرمایا: میرے بھتیجوں کو لے آؤ، ہمیں آپ کے سامنے پیش کیا گیا، گویا ہم چوزوں کی طرح تھے، فرمایا: نائی (بال بنانے والے) کو بلاؤ، نائی نے ہمارے بال صاف کیے، پھر (میرے بھائی محمد کے تعلق سے) فرمایا: ''محمدؐ'' میرے چچا ابوطالب کے مشابہ ہیں، (میرے تعلق سے) ارشاد فرمایا: عبداللہ خلق (ظاہری اوصاف) اور خلق (معنوی صفات وعادات کے) اعتبار سے میرے مشابہ ہیں، پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اُوپر کو اُٹھایا اور دعا فرمائی:

''اللّٰهم اخلف جعفرا في أهله وبارك لعبد الله في صفقته''. (مسندأحمد حديث عبدالله بن جعفر: ۱۷۵۰)

''اے اللہ! جعفر کے گھر میں اُن کا نعم البدل عطا فرما، عبداللہ کے کاروبار میں برکت عطا فرما''۔

عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے واپس تشریف لے آتے، تو استقبال کے لیے خاندانی بچوں کو بھی لے جایا جاتا، ایک مرتبہ آپ سفر سے واپس آرہے تھے، سب سے پہلے مجھے آپ کے سامنے پیش کیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے سامنے بٹھالیا، پھر حضراتِ حسنین میں سے کوئی آئے، تو اُن کو اپنے پیچھے بٹھالیا، ہم تین شخص سواری پر سوار ہوکر مدینے میں داخل ہوئے۔ (مسلم، کتاب فضائل الصحابہؓ، باب فضل عبداللہ بن جعفر: ۲۴۲۸)

آپ کی وفات سن چوراسی (۸۴) یا پچاسی (۸۵) ہجری میں ہوئی، ابان بن عثمانؓ امیر مدینہ تجہیز وتکفین میں شریک رہے، خود نمازِ جنازہ پڑھائی، جنازے کو کندھے پر اُٹھایا، جنازہ جنت البقیع پہنچنے تک کندھے سے جنازہ کو نہیں اُتارا، اُن کی آنکھوں سے آنسوں بہہ رہے تھے اور کہہ رہے تھے: خدا کی قسم! تم بہترین شخص ہو، تم میں کوئی خرابی نہیں ہے، تم شریف اور صلہ رحمی کرنے والے انسان ہو۔ (اسد الغابہ، ترجمہ: ۲۸۶۴، ۲/ ۵۶۸)

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ قریشی ہاشمی تھے، خاندانی صفات وکردار کے حامل انسان تھے، شریف، ذہین، چالاک، پاک دامن ومستغنی، سخی اور فیاض تھے، لوگوں میں آپ ''بحر الجودؓ'' سخاوت کے سمندر کے لقب سے جانے جاتے تھے، حافظ عبدالبرؒ نے لکھا ہے کہ اسلامی تاریخ میں آپ سے زیادہ کوئی سخی نہیں گذرا ہے۔

(الاستیعاب: ۳/ ۱۷)

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو ایک کروڑ درہم بطور قرض دیے ہوئے

تھے، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے حضرت عبداللہؓ سے کہا: حضرت زبیرؓ کی کاپیوں میں لکھا ہوا ہے کہ تمہارے لیے ایک کروڑ درہم حضرت زبیرؓ کے ذمے ہیں، حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے کہا: انہوں نے درست لکھا ہے، چند دن بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ملاقات کی اور کہا: کیا تم اپنا قرضہ بھول گئے؟ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ رقم ان ہی کے لیے ہے، مجھے واپسی کی ضرورت نہیں ہے۔ (سیر اعلام النبلاء، ترجمہ: ۳۱۵، ۴/۴۵۵)

ایک عورت آپ کے پاس ایک بھونی ہوئی مرغی لے آئی اور عرض کیا: میری یہ مرغی (موٹی تازی ہونے میں) میری بیٹی کے مثل تھی، میں نے قسم کھائی ہے کہ میں اس کو سب سے بہتر اور معزز جگہ میں دفن کروں گی، خدا کی قسم! تمہارے پیٹ سے زیادہ کوئی معزز جگہ نہیں ہے، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے خدام سے فرمایا: اس عورت سے یہ مرغی لے لو اور اس کو سامان دو؛ چناں چہ اس عورت کی خوب نوازش کی گئی، متنوع ہدایا دیے گئے؛ یہاں تک کہ اس عورت نے کہا: اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔ (سیر اعلام النبلاء، ترجمہ: ۳۱۵، ۴/۴۵۵)

نصیب نامی ایک شخص نے آپ کی تعریف کی، حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے اس کو اُونٹ، گھوڑے، کپڑے اور دینار ودرہم دیے، لوگوں نے عرض کیا: حضرت آپ نے اس کالے شخص کو اِتنا سارا مال دے دیا؟ فرمایا: اگر اس کا رنگ کالا ہے، تو اس کے بال سفید ہیں، اپنے کلام سے وہ اس مال سے زیادہ کا مستحق ہے، جتنا اُس نے پایا ہے، ہم نے اس کو فنا ہونے والا، بوسیدہ اور پُرانا ہونے والا سامان دیا ہے، اس نے باقی رہنے والی اور نقل کی جانے والی تعریف کی ہے۔ (الاستیعاب: ۳/۱۸)

(یعنی ہماری نیک نامی: عبادت، سخاوت، شرافت وغیرہ کو بیان کیا ہے، رہتی دنیا تک ہمارا تذکرہ ان صفات کے ساتھ کیا جاتا رہے گا، ہم نے اس کو جو مال دیا ہے، وہ چند دنوں میں ختم ہو جائے گا؛ لہٰذا اس کی تعریف کی بہ نسبت ہمارا مال کچھ قیمتی نہیں ہے۔)

معاویہ بن ابو معاویہ کہتے ہیں:

اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان کے سامنے عبید اللہ بن قیس کا شعر پڑھا گیا:

إنما مصعب شهاب من اللّٰه

تجلت عن وجهه الظلماء

''مصعب بن زبیر اللہ کے ایک شہاب (شہابِ ثاقب) ہیں، اُن کے چہرے سے تاریکیاں دُور ہوتی ہیں''۔

عبد الملک (جو مصعب بن زبیر کا دشمن تھا) نے عبید اللہ بن قیس کے خون کے ہدر ہونے کا اعلان کیا اور یہ منادی کرائی کہ جو شخص عبید اللہ بن قیس کو لے آئے گا، اس کو ایک ہزار دینار انعام دیا جائے گا۔

عبیداللہ بن قیس کہتے ہیں:

میں نے دمشق کی ایک گلی میں یہ نداسنی، پھر میں گھبرا کرایک تنگ گلی میں داخل ہوگیا، درمیانی گلی میں ایک گھر تھااور اُس کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اُس دروازے کے اندر داخل ہوگیا اور چھت پر چڑھ گیا، گھر کی مالک نے مجھے دیکھ لیا، اُس نے سمجھا کہ مجھے وضو کی ضرورت ہے؛ اِس لیے اُس نے اپنی خادمہ سے کہا: پانی لے جا کر دو، خادمہ نے چھت پر چڑھ کرآئی اور پانی رکھا اور واپس چلی گئی۔

جب میں نے نیچے اُترنے میں تاخیر کی، تو مالکن نے کہا: یہ خوف زدہ شخص ہے، اس کے لیے مہمان نوازی کا سامان لے جا کر دو، خادمہ بچھونا اوڑھنا اور کھانا پہنچایا، میں نے اُس گھر میں چار ماہ قیام کیا، صبح اور شام میری ضرورت کی چیزیں پہنچتی رہیں، پھر مالکن نے میرے احوال سے واقف ہونے کے بعد مجھے سو دینار دیے اور کہا: تم عبداللہ بن جعفرؓ کے پاس چلے جاؤ، تمہارے مسئلے کا حل اُن کے پاس موجود ہے۔

عبیداللہ بن قیس کہتے ہیں:

میں اُس گھر سے نکلا، عبداللہ بن جعفرؓ کو مدینہ منورہ میں پایا اور چہرے پر پردہ ڈال کر عبداللہ بن جعفرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، جب اُن کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوا، تو چہرہ سے پردہ ہٹایا اور سلام پیش کیا۔

عبداللہ بن جعفرؓ نے فوراً کہا: عبیداللہ! میں نے عرض کیا: جی ہاں!

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے فرمایا:

امیر المؤمنین تم سے ناراض ہیں اور تم میرے پاس آ گئے ہو؟

میں نے عرض کیا: میں آپ کے گھر میں داخل ہو گیا ہوں اور آپ کی امان میں آ چکا ہوں، آپ کی نگاہ مجھ پر پڑ چکی ہے، آپ میری جان بخشی کرادیجیے، اللہ آپ کی جان بخشی کردے۔

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے تھوڑی دیر سر جھکائے رکھا، پھر اپنے خزانچی سے فرمایا: ان کو اپنا مہمان بنائے رکھو اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرنا، یہاں تک کہ امیر المؤمنین کے پاس اُن کے حق میں میری جان بخشی کی سفارش قبول کرلی جائے، اُن کے لیے میں نے جو امان دی ہے، اُس کو قبول کرلیں اور مجھ سے فرمایا: تم ہرگز ہرگز حکومت کی طرف سے دیا جانے والا وظیفہ نہ لو۔

میں نے عبداللہ بن جعفرؓ سے کہا: پھر آپ کی امان کا مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ آپ نے مجھے زندہ ہونے کی حالت ہی میں مُردہ بنا کر چھوڑ دیا ہے؟ (زندہ رہ کر بھی سرکاری وظیفہ حاصل نہ کروں، جیسے مُردے حاصل نہیں کرتے)۔

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے فرمایا، تمہاری عمر کتنی ہے؟ عرض کیا: ساٹھ سال۔

فرمایا: وظیفہ کتنا ہے؟

عرض کیا: ہر سال ایک ہزار درہم ملتے ہیں۔

فرمایا: تمہاری عمر میں جتنا چاہے اضافہ کرو، انہوں نے بیس سال کا اضافہ کیا۔

پھر پوچھا: اس صورت میں کتنا وظیفہ ہوتا ہے؟

عرض کیا: ہر سال دو ہزار درہم۔

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے خادم کو حکم دیا کہ فوری طور سے اُنہیں دو ہزار درہم نقد دے دو اور مجھ سے فرمایا: زندگی بھر اتنی مقدار میں تمہارا وظیفہ ہوگا۔

(اخرجہ ابن عساکر بنفس الاسناد فی ترجمۃ: عبیداللہ بن قیس بن شریح بن مالک: ۴۴۷۸)

عبرت ونصیحت:

ایک عرب خاتون نے ایک مظلوم کی جان بچانے میں مدد کی، چار ماہ تک اُن کی مہمان نوازی کرتی رہیں، جب اُن کے حالات معلوم ہوئے کہ یہ جان بچانے کے لیے بھاگتے ہوئے اُن کے گھر میں آ گئے ہیں، تو جان بخشی کا راستہ بتایا اور جس بزرگ کی خدمت میں روانہ کیا اُن تک پہنچنے کے لیے سو دینار گویا بطور کرایہ بھی دیا، اُس خاتون کا تعاون، ہمدردی اور کوشش کامیاب ہوئی اور اُن کی جان بخشی ہوگئی۔

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ خاندانِ نبوت کے چشم و چراغ، دیگر سادات کی طرح فیاض، بیت المال سے عبیداللہ بن قیس کو جو وظیفہ ملتا تھا، اُس کا دوگنا وظیفہ اپنی طرف سے جاری کیا، یہ ہے شرافت، سخاوت، جود و کرم۔

علامہ ابنِ سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ایک تاجر مدینہ منورہ شکر لے آیا، اُس کی شکر (چینی) فروخت نہیں ہوئی، یہ خبر حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کو ہوئی، تو اُنہوں نے اپنے خزانچی سے فرمایا: اُس شکر کو خرید لو اور لوگوں میں بطورِ ہدیہ تقسیم کردو۔

اکابرِ امت چھوٹے موٹے تاجروں کا سامانِ تجارت خرید کر اُن کی مدد وتعاون کرتے ہیں؛ تاکہ اُن کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو اور اُن کا تعاون بھی ہو جائے۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کو بظاہر شکر کی ضرورت نہیں تھی، آپ نے محض اس چھوٹے تاجر کی مدد ونصرت کی نیت سے اُن سے شکر خرید کر لوگوں میں تقسیم فرمائی؛ لہٰذا سرمایہ دار اور اصحابِ ثروت کو چاہیے کہ وہ اِس طرح کے تاجروں کی حوصلہ افزائی اور اُن کے تعاون کا خیال رکھیں۔

(اخرجه ابن عساكر في ترجمة: عبد الله بن جعفر ذي الجناحين الطيار بن أبي طالب: ٣٢٢٢، وابن سعد في الطبقات، والخطيب في تاريخه، وابن كثير في البداية والنهاية وغيرذلك، واللفظ لابن عساكر)

علامہ محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ایک شخص مدینہ منورہ شکر (چینی) برائے فروخت مدینہ منورہ لے آیا، اُس کی شکر فروخت نہیں ہوئی، لوگوں نے اُس سے کہا: عبداللہ بن جعفرؓ سے اپنی شکر فروخت کردو، وہ شخص حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے پاس آیا، حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے وہ شکر دس بارہ ہزار درہم میں خریدی اور اعلان کیا: جو شخص اس شکر میں سے کچھ لے گا وہ شکر اُسی کے لیے ہوجائے گی۔ اِس اعلان کو سن کر فروخت کرنے والے شخص نے عرض کیا: حضرت! میں بھی اپنا حصہ لے سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا: ضرور لیجیے۔

(أخرجه ابن عساكر في ترجمة: عبد الله بن جعفر ذي الجناحين الطيار بن أبي طالب:۳۲۲۲)

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ

نا قابلِ معافی گناہ

ازقلم: فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

اسلام کی نگاہ میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک اور کفر ہے، اس کی سزا ہمیشہ کے لیے دوزخ ہے، جو شخص کفر کی حالت میں دنیا سے چلا جائے، اُس پر جنت کے دروازے بند ہیں اور ہمیشہ کے لیے آتشیں دوزخ کی آغوش اُس کی رفیق ہے گی، کفر کے بعد ایک ہی عمل ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اُس کا مرتکب ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا، اُس پر اللہ کا غضب ہوتا رہے گا اور اللہ کی لعنت برستی رہے گی، کتنا گھبرا دینے اور تڑپا دینے والا ہے یہ ارشادِ ربانی:

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءُهٗ جَهَنَّمُ، خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾ (نسا:۹۳)

’’جو جان بوجھ کر کسی مسلمان کو قتل کردے، اُس کا بدلہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، اُس پر اللہ کا غضب اور اُس کی لعنت ہو اور اللہ نے اُس کے لیے بھیانک عذاب تیار کر رکھا ہے‘‘۔

کتنی لرزہ براندام کردینے والی ہے یہ آیت!؛ لیکن اُس شخص کے لیے جس کے دل میں خوفِ خداوندی کا کوئی گوشہ موجود ہو، جس کی آنکھ کبھی کبھی سہی، اللہ کے خوف سے نم ہونا جانتی ہو، جس کا دل آخرت کے تصور سے لمحہ دو لمحہ سہی، لرزنے سے آشنا ہو، جو آخرت کی وسعتوں پر یقین رکھتا ہو، جس کا جنت کی نعمتوں اور دوزخ کی ہولناکیوں پر ایمان ہو اور جس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہو، جن سینوں میں دل کے بجائے پتھر کی سِل رکھی ہوئی ہو اور جن قلوب میں محبت کی شبنم کے بجائے نفرت اور ظلم وجور کی بھٹیاں سلگ رہی ہوں، اُن کے بارے میں کیوں کر سوچا جاسکتا ہے کہ خالقِ کائنات کا یہ ارشاد بھی اُن کو تڑپا سکے گا اور خدا و رسول کی بات بھی اُن کے دلوں پر دستک دے سکے گی؟؟

آہ! کس قلم سے لکھا جائے اور کس زبان سے بولا جائے کہ ہمارے شہر میں ابھی دو ہفتہ کے مختصر عرصہ میں ایک درجن سے زیادہ مسلمانوں کا بے دردانہ قتل ہو چکا ہے، کن کے ہاتھوں؟ کیا کسی غیر مسلم کے ہاتھ؟ کیا کسی دشمنِ اسلام کے ذریعے؟؟ نہیں! حیرت کے کانوں سے سنیے کہ ایک کلمہ گو نے دوسرے کلمہ گو کو ناحق قتل کیا ہے،

ایک مسلمان کی تشنہ تلوار نے ایک مسلمان ہی کے لہو سے اپنی پیاس بجھائی ہے، سستے داموں خدا کا غضب خریدا ہے، اپنے گلے کو لعنتِ خداوندی کے طوق سے آراستہ کیا ہے اور ابدی دوزخ حاصل کی ہے، اس بے حسی پر آنکھیں جس قدر آنسو بہائیں، دل جتنا تڑپے اور روئے کم ہے، ہائے! یہ اس اُمت کا حال ہے جس کو آخر آخرِ دم تک اُس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کے خون کی حرمت بنائی تھی اور ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو سے ہاتھ رنگنے کو منع فرمایا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو معاف فرمادیں گے سوائے اِس کے کہ کوئی شخص شرک کی حالت میں مَرے یا کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کردے۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۲۷۰) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی مومن کو قتل کیا اللہ تعالیٰ نہ اُس کی کوئی فرض نماز قبول فرمائیں گے اور نہ نفل: ''لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ مِنْهُ صَرْفًا وَلَا عَدْلًا'' (ابوداؤد، کتاب الفتن، باب فی تعظیم قتل المؤمن، حدیث نمبر: ۴۲۷۰) اور کیوں نہ ہو کہ مومن کا قتل اللہ کے نزدیک دنیا کے ختم ہوجانے سے بڑھ کر ہے: ''قَتْلُ الْمُؤْمِنِ أَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ زَوَالِ الدُّنْيَا'' (نسائی، حدیث نمبر: ۳۹۹۰) حضرت ابوسعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تمام اہلِ زمین اور اہلِ آسمان بھی ایک مسلمان کی موت میں شریک ہوں، تو اللہ اُن سب کو جہنم میں اوندھے منھ ڈال دے گا۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۳۹۸) اس سے اندازہ کیجیے کہ مومن کے خون کی کیا حرمت اور عظمت ہے اور کسی مسلمان کا جان لینا کیسی لعنت اور غضبِ الٰہی کو دعوت دینا ہے! اِسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن برابر دین کے معاملہ میں وسعت و گنجائش میں رہتا ہے، جب تک کہ کسی خونِ حرام کا مرتکب نہ ہو۔ (بخاری، کتاب الدیات، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا الخ﴾ حدیث نمبر: ۶۸۶۲)

جیسے قتل کرنا گناہ ہے، اِسی طرح قتل میں تعاون بھی گناہ ہے؛ بلکہ اگر کسی شخص نے دوسرے کو قتل پر اُکسایا ہو تو اُس کا گناہ اصل قاتل سے بھی بڑھ کر ہے، ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قاتل اور قتل کا حکم دینے والے کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جہنم کے ستر حصے کیے جائیں گے جس میں اُنہتر (۶۹) حصہ قتل کا حکم دینے والے کے لیے ہوگا اور ایک حصہ خود اس قاتل کے لیے اور یہ ایک حصہ بھی اُس کے لیے بہت کافی ہوگا: ''وللقاتل جزء وحسبه''. (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۳۰۶۶ عن مرثد بن عبداللہؓ)

نہ صرف یہ کہ قتل پر اُکسانا اور اُبھارنا بہت بڑا گناہ ہے؛ بلکہ مقتول کو بچانے کی کوشش نہ کرنا اور پہلوتہی سے کام لینا بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق بنادیتا ہے؛ چناں چہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہاں کسی شخص کا ظلماً قتل ہو، وہاں تم کھڑے نہ ہو، وہاں موجود رہنے والوں پر بھی اللہ کی لعنت ہوتی ہے کہ انھوں نے اسے بچایا کیوں نہیں، اور جہاں کسی شخص کو ظلماً زدوکوب کیا جارہا ہو، وہاں بھی نہ ٹھہرو؛ کیوں کہ حاضرین پر بھی اللہ کی لعنت ہوگی کہ انھوں نے مدافعت کیوں نہیں کی۔

(الطبرانی فی الکبیر، باب العین، حدیث نمبر:۱۱۶۷۵، ۱۱/۲۶۰)

اصل یہ ہے کہ کسی شخص کو قتل کرنا اِس بات کی علامت ہے کہ اُس کے ذہن میں انسانی خون اور انسانی زندگی کا احترام نہیں، اور یہ بہت ہی خطرناک بات ہے؛ اِسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ایک نفسِ انسانی کا قتل پوری انسانیت کو قتل کرنے اور ایک انسان کو بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف ہے: ﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا، وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ (المائدۃ:۳۲)

اس جرم کے شدید ہونے کی وجہ ظاہر ہے، زندگی اللہ کی امانت ہے، جان دینا اور جان لینا اللہ ہی کا حق ہے، قاتل گویا اللہ کا حق اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے، اس سے بڑھ کر سرکشی اور کیا ہوگی؟ پھر خود مقتول کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی ہے، ایک تو قتل کی تکلیف سے بڑھ کر کسی اور تکلیف کا تصور نہیں کیا جاسکتا، دوسرے: قاتل اسے ایسی نعمت سے محروم کرتا ہے، جس کی واپسی ممکن نہیں اور جس کا بدل ناقابلِ حصول ہے، یہ تو خود قاتل کا معاملہ ہے، پھر غور کیجیے کہ ہر انسان کے ساتھ کتنے ہی حقوق متعلق ہیں، معصوم بچوں اور بچیوں کی تربیت اس کے ذمہ تھی، جو ان بہنوں کی شادی کا وہی ذمہ دار تھا، بوڑھے ماں باپ کی کفالت اُسی کے سر تھی، بیوی کا سہاگ اُس کے دم سے قائم تھا، خاندان کی کتنی ہی آرزوئیں اور تمنائیں اُس سے متعلق تھیں اور سماج کی کتنی ہی اُمیدیں اور توقعات اس سے وابستہ تھیں، بظاہر یہ ایک جان کا قتل ہے؛ لیکن درحقیقت وہ کتنی ہی تمناؤں، حسرتوں، اُمیدوں اور آرزوؤں کا قاتل ہے، اُس نے ایک بے قصور عورت کو بیوہ کیا، معصوم بچوں کو یتیم اور بے سہارا بنایا، بوڑھے ماں باپ سے اُس کا عصائے پیری چھین لیا ہے اور چھوٹے بھائیوں بہنوں کی اُمیدوں کے محل کو خاکستر کرکے رکھ دیا ہے؛ اِس لیے یقیناً اُس نے ایک شخص کا نہیں؛ بلکہ ایک خاندان کا، ایک کنبہ کا اور انسانیت کا قتل کیا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انتقام کا قانون رکھا ہے کہ یا تو خود قاتل کیفرِ کردار تک پہنچا دیا جائے۔ (البقرہ:۱۷۸) اگر مقتول کے اولیا رضامند ہوجائیں تو اُن کو دیت ادا کی جائے، جو سو اُونٹ یا اُس کی قیمت ہے، احادیث میں اُس کی تفصیل موجود ہے، مقصد اس دیت کا یہی ہے کہ ایک شخص کے قتل کی وجہ سے مقتول کے خاندان کو جو نقصان پہنچا ہے وقتی طور پر سہی، کچھ تو اس کی اشک شوئی ہوجائے اور ہنگامی مدد تو اسے مل جائے، یہ خون بہا اس وقت بھی

واجب ہے، جب کسی شخص کو دھوکہ میں قتل کردے، (النساء:۹۲) اوراس غلطی کی صورت میں صرف دیت ہی کافی نہیں؛ بلکہ کفارہ بھی واجب ہے کہ مسلسل دو ماہ روزے رکھے جائیں، (النساء:۹۲) اگر جان بوجھ کر قتل کیا ہو تو اُس کے لیے کوئی کفارہ متعین نہیں کیا گیا، زندگی بھر توبہ واستغفار کرتا رہے؛ کیوں کہ یہ اتنا بڑا جرم اور اتنا شدید گناہ ہے کہ کوئی عمل اس کا کفارہ بن نہیں سکتا، یہ کفارہ اسی لیے ہے کہ حقوق اللہ میں جو دست درازی ہوئی ہے، اُس کی کچھ تلافی ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ سے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: آج کون سا دن ہے؟ یہ کون سا مہینہ ہے؟ اور یہ کون سی جگہ ہے؟ پھر فرمایا کہ یہ حرام مہینہ، حرام دن اور حرام سرزمین یعنی حدودِ حرم کا علاقہ ہے، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ مسلمان کی جان و مال اور عزت وآبرو اس سے بھی زیادہ قابلِ حرمت ہیں۔ (صحیح بخاری، کتاب العلم، باب قول النبی: رب مبلغ أوعٰی من سامع، حدیث نمبر: ٦٧) اگر اس پیغمبر رحمت کی اُمت مسلمانوں کے؛ بلکہ انسانوں کے خون کی اہمیت وحرمت کو نہ سمجھ سکے اور اس کے ہاتھ ایک دوسرے کے خون سے رنگین ہوں تو اس سے بڑھ کر بھی قابلِ افسوس، لائقِ حیرت اور تعجب انگیز کون سی بات ہوگی؟!

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ (قسط دوم)

یتیموں کی خبر گیری کرنا

ازقلم: حضرت مولانا مفتی سیّد محمد عفان صاحب منصور پوری (صدر المدرسین جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ)

عن عبدالرحمٰن بن ابزي قال: قال داؤد عليه السلام: كن لليتيم كالأب الرحيم. واعلم أنک كما تزرع كذٰلک تحصد، ماأقبح الفقر بعد الغنى وأكثر من ذٰلک الضلالة بعد الهدىٰ، وإذا وعدت صاحبک فأنجزله ماوعدته، فإن لاتفعل يورث بينک وبينه عداوة، وتعوذ بالله من صاحب إن ذكرت لم يعنک وإن نسيت لم يذكرک. (اخرجه البيهقي في الشعب: ۳۹۳/۱۳)

ترجمہ: حضرت داؤد علیہ السلام فرماتے ہیں: یتیم کے لیے شفیق باپ کی طرح رہو اور جان لو جیسی کھیتی کروگے ویسا ہی کاٹو گے۔ مالداری کے بعد تنگ دستی کتنی تکلیف دہ چیز ہے اور اس سے زیادہ خطرناک ہدایت کے بعد گمراہی ہے اور جب اپنے ساتھی سے وعدہ کرو تو اُسے پورا کرو، اگر پورا نہیں کروگے تو یہ وعدہ خلافی تمہارے اور ساتھی کے درمیان دشمنی پیدا کردے گی اور ایسے ساتھی سے اللہ کی پناہ چاہو کہ اگر تم اللہ کا ذکر کرو تو وہ تمہاری مدد نہ کرے اور اگر تم ذکرِ الٰہی کو بھول جاؤ تو وہ تمہیں یاد نہ دلائے۔

دھڑکتا ہوا دل

حضرت داؤد علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ یتیم کے لیے تمہارے سینے میں ایک مہربان باپ کی طرح دھڑکنے والا دل ہونا چاہیے، جیسے مشفق باپ کا دل اپنے بیٹے کے لیے دھڑکتا ہے اِسی طرح ایک مسلمان کا دل ایک یتیم کے لیے دھڑکنے والا ہو، اپنی اولاد کا کوئی بُرا نہیں چاہتا، اپنی اولاد کو کوئی تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتا، کوئی اپنی اولاد کو بے عزت اور پریشانی میں نہیں دیکھنا چاہتا، اِسی طرح ایک مسلمان کا یہ بھی فریضہ ہے کہ کسی یتیم، کسی بیوہ اور ضرورت مند کو بھی پریشانی میں نہ دیکھے، جہاں تک ہوسکے اُن کی مدد کرنے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ نے نبیٔ کریم علیہ الصلاۃ والسلام کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ (سورۂ ضحیٰ) آپ یتیم تھے، ہم نے آپ کو ٹھکانہ دیا اور آپ کی قدم قدم پر نصرت کی، آپ بھی یتیم کے ساتھ شفقت کا معاملہ کریں، اُن

کے لیے ذلت ورُسوائی اوراہانت کا سامان ہرگز نہ کرنا چاہیے۔ حضرت داؤدعلیہ السلام کے کلام سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید تمام شرائع وادیان میں کی گئی ہے اور پھر حضرت داؤدعلیہ السلام نے اُصولی بات بیان فرمائی کہ جیسا کروگے ویسا پاؤ گے، جیسی کھیتی کروگے ویسی ہی کاٹوگے۔

مالداری کے بعد تنگ دستی

"ما أقبح الفقر بعد الغنى" (مال داری کے بعد تنگ دستی کتنی بُری چیز ہے؟) اللہ تعالیٰ نے مال ودولت سے مالامال کیا، پھر اس کے بعد آزمائش میں مبتلا کردیا گیا اور مال اُس کے ہاتھ سے نکل گیا تو یہ بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ ایک تو وہ آدمی ہے جو شروع سے ہی تنگی کی زندگی گذاررہا ہے، اُس پر اگر مزید تنگی آئے گی تو کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا؛ کیوں کہ وہ تنگی کی زندگی گذارنے کا عادی بن چکا ہے۔ دوسرا وہ آدمی ہے جس کو اللہ نے خوب مال ودولت دیا ہے، اُس کا معیارِ زندگی بدل گیا، ہفتوں میں ہزاروں خرچ کرنے والا بن گیا، اور وہ اچانک ایسی آزمائش میں گھرا کہ آمدنی کے اسباب وذرائع بند ہوگئے، یہ شخص بڑی کرب اور تکلیف کے اندر مبتلا ہوگا؛ کیوں کہ مالداری دیکھنے کے بعد تنگ دستی اُس کی زندگی میں آرہی ہے، اب یہ اپنے شوق پورے کرنے پر قادر نہیں ہوگا، اپنی ضروریات پہلے کی طرح پوری کرنے پر قادر نہیں ہوگا۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جو دعائیں سکھائی ہیں اُن میں سے ایک دعا یہ بھی ہے: اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِکَ مِنَ الْفَقْرِ بَعْدَ الْغِنٰی. اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں مال داری کے بعد تنگ دستی کے آنے سے۔

ہدایت کے بعد گمراہی

"وأكثر من ذٰلک الضلالة بعد الهدىٰ" (سب سے بُری چیز یہ ہے کہ انسان ہدایت کے بعد گمراہی کی زندگی میں مبتلا ہوجائے)، مالداری کے بعد فقر وفاقہ جھیلنا یہ بھی بڑی آزمائش ہے؛ لیکن ہدایت کے بعد گمراہی میں مبتلا ہوجانا یہ بدترین آزمائش ہے، اللہ نے ہمیں نمازوں کی پابندی کی توفیق دی، رمضان کے روزوں کی توفیق دی، قرآنِ پاک کی تلاوت کی توفیق دی؛ لیکن اس کے بعد بُری صحبت یا غفلت اختیار کرنے کے نتیجہ میں دماغ ایسا پھرا نہ نماز کے قریب پھٹکتا ہے نہ قرآنِ کریم کھول کر دیکھتا ہے، یہ وہی ہے جس نے ہدایت اختیار کرنے کے بعد گمراہی کا راستہ اختیار کیا ہے؛ کیوں کہ ہدایت کا حاصل ہوجانا یہ اللہ کا عظیم الشان انعام ہے۔ دین کے کاموں میں حصہ لینا یہ اللہ کی طرف سے حاصل ہونے والی عظیم سعادت ہے، اس سعادت اور انعام کو اپنی زندگی میں برقرار رکھنے کی کوشش کرنا یہ ہر مسلمان کا فریضہ اور ذمہ داری ہے، اگر کوئی آدمی ان سعادتوں کو برقرار رکھنے میں کامیاب

نہیں ہو پا رہا ہے، اچھے طریقہ کو چھوڑ کر پھر بُرے طریقہ کو اختیار کر رہا ہے تو یہ اُس کے لیے آزمائش اور محرومی کی چیز ہے۔ اِس سلسلہ میں بہت فکر مند ہو کر زندگی گذارنے کی ضرورت ہے۔ بہت سے مسلمان بھائی ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی زندگی کے رنگ بدلتے رہتے ہیں، کبھی وہ دینی اعتبار سے بہت اچھی حالت میں دکھائی دیتے ہیں اور کبھی اُن کو دیکھ کر یقین نہیں ہو پاتا کہ یہ وہی ہمارا بھائی ہے جو ایک طویل زمانہ تک دین کے تقاضوں پر مضبوطی کے ساتھ عمل کرتا رہا، جماعت میں وقت لگا لیتے ہیں، نمازوں کے اہتمام کی توفیق مل جاتی ہے، دین کے جذبات زندگی کے اندر پیدا ہو جاتے ہیں؛ لیکن کچھ دنوں تک وہ جذبات باقی رہتے ہیں، پھر اپنی پرانی ڈگر پر واپس آجاتے ہیں، کچھ خوش نصیب لوگ ایسے ہیں جو رمضان جیسے مہینہ کی تربیت کو اپنے لیے غنیمت جانتے ہیں اور اپنی پوری زندگی کو اسی فکر اور رُخ پر گذارنے کی کوشش کرتے ہیں، یہی لوگ سعید و کامیاب ہیں۔

وعدہ کی تکمیل

اِس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام نے نصیحت فرمائی: "**إذا وعدت صاحبک فأنجز له ما وعدته**" (جب تم اپنے کسی ساتھی سے کوئی وعدہ کرو تو اُس کو پورا کرو)، وعدہ صرف زبانی اور اپنے مقصد اور مفاد کو حاصل کرنے کے لیے نہیں ہونا چاہیے؛ بلکہ وعدہ پورا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اگر آپ وعدہ پورا نہیں کروگے تو دشمنی کا بیج اُس کے اور آپ کے درمیان اُگ جائے گا۔ وعدہ پورا نہ کرنا یہ دشمنی کے پیدا ہونے کا سبب ہے۔ ہم نے کسی کے سامنے ضرورت کا اظہار کر کے ایک ماہ کے لیے قرض لے لیا اور جب ادائیگی کا وقت آیا اور دینے والے نے ہم سے مطالبہ کیا تو اب ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں، چکر کٹوا رہے ہیں، باعزت آدمی تو بار بار کہتے ہوئے بھی کتراتا ہے کہ اب میں اسے کب کب اور کہاں کہاں ٹوکوں؟ اور لینے والے اِتنے جری ہو جاتے ہیں کہ جب دینے والا بار بار مانگتا ہے تو اُلٹا اُسے ڈانٹتے ہیں کہ لے کر بھاگ تھوڑی رہا ہوں، جب لینے آیا تھا تو بڑی منت سماجت کر رہا تھا کہ تم میرے بڑے خیر خواہ ہو، تم ہی ہر جگہ میرے کام آتے ہو، اب جب ادائیگی کا وقت آیا تو یہی آدمی اُس کو سب سے بُرا لگ رہا ہے، یہ معاملات لوگوں کے درمیان عام ہیں، کتنے لوگ وہ ہیں جو پختہ وعدہ کر کے زبان سے مکر جاتے ہیں اور کتنے لوگ ایسے ہیں کہ جن کے کاروبار کی بنیاد ہی جھوٹ پر ہے، کہتے ہیں کی اگر سچائی کے ساتھ کاروبار کریں تو نفع ہی نہیں ہوگا، یہ نفع کیا ہے، یہ تو بے برکتی ہے، نقصان ہے، خسارہ ہے، دیکھنے میں چاہے دو روپے زیادہ آرہے ہوں؛ لیکن یہی دو روپیہ ہمارے کاروبار کی روح اور جان نکال دیتا ہے، جو وعدہ کیا جائے اُس پر مضبوطی کے ساتھ عمل کرنے کی کوشش کی جائے، ایک مسلمان کو زبان کا پکا ہونا چاہیے۔

نکاح کے اندر مہر بھی ایک وعدہ ہوتا ہے،شوہر کے اوپر وہ قرض ہوتا ہے،اُس کی ادائیگی واجب ہوتی ہے، رجسٹر میں تو مہر لکھوالیا،اور جب بیوی آ گئی تو لگے معاف کرانے،اب اُس کی منت سماجت کررہے ہیں، بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کوادائیگی کی فکر ہی نہیں ہوتی،معاف کرانے کے چکر میں پڑ جاتے ہیں؛ حالاں کہ مہر حق واجب ہے جس کو ہر حال میں دینا پڑے گا،وعدہ کیا ہے تو پورا کیا جائے،نہیں پورا کیا جائے گا تو یہ چیز دلوں میں دُوریاں پیدا ہونے کا باعث بنیں گی۔

اچھا دوست

اخیر میں حضرت داوٗد علیہ السلام نے فرمایا: اللہ کی پناہ چاہا کرو،ایسے ساتھی سے کہ اگر تم اللہ کا ذکر کرو تو وہ تمہاری مدد کرنے والا نہ ہو، دین کے کاموں میں تمہارا مددگار نہ ہو، بہترین ساتھی وہ ہوتے ہیں جو اچھائی کی کاموں میں تمہارا ہاتھ بٹانے والے ہوں، نیکی کے کاموں میں تمہارا ساتھ دینے والے ہوں، جو اللہ کو راضی کرنے والے اعمال میں تمہارا حوصلہ بڑھانے والے ہوں، وہ ساتھی اچھے ساتھی کہلاتے ہیں اور جو ساتھی اچھائی کے کاموں میں تمہارا ساتھ نہ دیتا ہو،نیکی کے کاموں میں تمہاری مدد نہ کرتا ہو، وہ اچھا ساتھی کہے جانے کے لائق نہیں،اُس سے تو تم جتنی دُوری اختیار کروگے اُتنی ہی تمہاری بھلائی ہوگی،اور فرمایا کہ اللہ کی پناہ چاہو ایسے ساتھی سے بھی کہ اگر تم خیر کا کام کرنا بھول جاوٗ تو وہ تم کو یاد نہ دلائے،مثلاً نماز کا وقت ہو رہا ہے اور تم کسی کام میں لگے ہو اور تمہاری توجہ نماز کی طرف نہیں ہے تو تمہارا ساتھی ایسا ہونا چاہیے کہ جو تمہیں ٹوکے کہ نماز کا وقت ہوگیا، کام چھوڑو،مسجد چلو،اگر تمہارا ساتھی تم کو نہیں ٹوکتا نہ خود مسجد جارہا ہے نہ تم کو کہہ رہا ہے تو یہ ساتھی ساتھی بنانے کے لائق نہیں، ساتھی بنانے کے لائق وہ آدمی ہے اگر تم اچھائی کا کام بھول رہے ہو تو تمہیں یاد دلائے کہ یہ اللہ کی یاد کا وقت ہے،ایسا ساتھی انسان کو اگر میسر ہوجائے تو اُس کی دنیا بھی بن جائے گی اور آخرت بھی سنور جائے گی۔

عبرت آموز واقعہ

بلخ کے علاقہ میں ایک شریف علوی خاندان رہا کرتا تھا، یہ لوگ کسی دوسرے علاقہ سے آ کر یہاں بس گئے تھے، کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اس خاندان کے سرپرست اور بچوں کے باپ کا انتقال ہوگیا،اب گھر میں صرف بیوہ اور اُس کی دو لڑکیاں رہ گئیں، یہ لوگ بہت پریشان ہوئے؛ اس لیے انہوں نے لوگوں سے مدد حاصل کرنا چاہی، ماں اپنے بچوں کو لے کر دوسرے شہر چلی گئی؛ تاکہ شماتتِ اعداء اور دشمنوں کی خوشی سے محفوظ رہ سکے۔ سردی کا موسم تھا اُس نے ایک غیر آباد مسجد میں بچوں کو چھوڑا اور کھانے پینے کا بندوبست کرنے کے لیے باہر نکلی،

بیوہ کا گذر دو آدمیوں کے پاس سے ہوا، اُن میں سے ایک مسلمان تھا دوسرا مجوسی، پہلے یہ عورت مسلمان کے پاس گئی، اُس کے سامنے اپنے حالات بیان کیے، اپنی ضرورت کا اظہار کیا، تو اُس مسلمان نے کہا کہ میں تو تمھیں نہیں جانتا، تم دلیل پیش کرو کہ واقعتاً تم ضرورت مند ہو، اور شرفاء یعنی علوی خاندان سے تمہارا تعلق ہے، جب تک تم کوئی سند اور ثبوت پیش نہیں کروگی اُس وقت تک میں تمہاری مدد نہیں کرسکتا، اُس عورت نے کہا کہ میں یہ ثبوت کیسے دے سکتی ہوں، میں اِس علاقہ کے اندر اجنبی اور پرائی ہوں، کوئی یہاں میرا شناسا اور واقف کار نہیں؛ اس لیے میں کوئی حجت اور دلیل تو پیش نہیں کرسکتی، تم میری مدد کرسکتے ہو تو کرو؛ ورنہ اللہ میرے لیے کوئی اور انتظام کرے گا، مسلمان نے اُس عورت اور یتیم بچوں کی کوئی مدد نہ کی؛ وہ آگے نکل گئی۔

راستہ میں ایک مجوسی ملا، اُس نے اُس کے سامنے بھی اپنی ضرورت کا اظہار کیا، اُن یتیم بچوں کے بارے میں بتایا جن کو مسجد کے اندر چھوڑ کر آئی تھی، اللہ نے اُس مجوسی کے دل میں بیوہ اور یتیم بچوں کے لیے مدد کا جذبہ ڈال دیا، اُس نے کوئی دلیل اور سند نہیں مانگی؛ بلکہ بیوہ سے اُس کا اور اُس کے بچوں کا پتہ معلوم کیا، اپنے گھر کی عورتوں کو اُس مجوسی نے بیوہ اور بچوں کے پاس بھیجا اور اُن سب کو بلالیا، اور گھر لانے کے بعد بہت اعزاز کا معاملہ اُن کے ساتھ کیا، اچھے کپڑے اُن کو پہنائے، اچھا کھانا کھلایا۔ اِسی دَوران اُس مسلمان کو رات میں نبیٔ کریم علیہ السلام کی خواب میں زیارت ہوئی، آپ علیہ السلام ایک بہت ہی عالی شان محل میں تشریف فرما ہیں جس میں طرح طرح کے ہیرے جواہرات اور پتھر جڑے ہوئے ہیں، اُس مسلمان کو وہ عالی شان محل بہت پسند آیا، اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! یہ محل کس کا ہے؟ تو نبیٔ کریم علیہ السلام نے جواب دیا کہ یہ محل ایک مسلمان کا ہے جو ایک خدا کی عبادت کرنے والا ہے، تو اُس نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں بھی تو مسلمان ہوں اور ایک خدا کی عبادت کرنے والا ہوں، تو نبیٔ کریم علیہ السلام نے فرمایا کہ اچھا تو مسلمان ہے، تو اپنے مسلمان ہونے کی دلیل پیش کر، اُس نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں کہہ رہا ہوں کہ میں مسلمان ہوں، تو آپ نے فرمایا کہ نہیں کہنے سے کام نہیں چلے گا، دلیل پیش کرو اپنے اسلام کی، پھر آپ نے یاد دلایا کہ ایک ضرورت مند بیوہ علوی خاندان سے تعلق رکھنے والی اپنا حال بیان کرکے تم سے مدد کی درخواست کررہی تھی، تم نے اُس سے دلیل مانگی تھی، آج تمہیں اپنے اسلام کی دلیل پیش کرنی پڑے گی، یہ محل تو اُسی کو ملے گا جو مسلمان ہوگا اور ایک خدا کی عبادت کرتا ہوگا، تم دلیل پیش نہیں کرسکے؛ اس لیے تم کو نہیں ملے گا۔ اُس آدمی کی آنکھ کھل گئی، اُس کو احساس ہوگیا کہ مجھ سے کیا غلطی ہوگئی، مجھے اُس عورت کو واپس نہیں بھیجنا تھا، ہر حال میں اُس کی مدد کرنی تھی۔ اُس عورت کی تلاش میں وہ سرگرداں ہوگیا کہ کہیں سے وہ عورت مجھے مل جائے، میں اُس کی مدد کردوں؛

تا کہ میں بھی اللہ کی نگاہ میں جنت کے محلات کا مستحق بن جاؤں۔ تلاش کرتے کرتے اُسے پتہ چل گیا کہ وہ عورت ایک مجوسی کے گھر میں زندگی گذار رہی ہے؛ چناں چہ یہ مسلمان اُس آتش پرست کے پاس گیا اور اُس کے سامنے اپنی اِس خواہش کا اظہار کیا کہ جو خاندان تمہارے یہاں رہتا ہے میں اُسی خاندان کو لینے کے لیے آیا ہوں۔ مالک نے کہا کہ بھئی! وہ خاندان تو ہمارے پاس سے جا ہی نہیں سکتا، ہم جانتے ہیں کہ اُس خاندان کو اپنے گھر لانے کے بعد ہمیں کتنی برکتیں میسر ہوئی ہیں، اور ہماری زندگیوں میں کیسی تبدیلی آئی ہے اور ہمیں کیسا سکون ملا ہے، یہ صرف ہم جانتے ہیں، ہم اللہ کی دی ہوئی یہ نعمت تمہارے حوالے کیسے کردیں؛ چناں چہ اُس مسلمان نے دس ہزار درہم اُن کو دینے چاہے کہ تم اُن کو لے لو اور بیوہ کے خاندان کو ہمارے حوالے کردو، مجوسی نے انکار کر دیا۔ اخیر میں اُس نے کہا جس چیز کو تم لینا چاہتے ہو میں اُس کا زیادہ حقدار ہوں اور جو عالی شان محل تم نے خواب میں دیکھا وہ میرے لیے بنایا گیا ہے۔ کیا اپنے اسلام کے سلسلہ میں تم دلیل پیش کروگے؟ رہا میرا معاملہ تو گذشتہ رات میں اور میرے گھر کے تمام افراد اس علوی مہمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر چکے ہیں جس طرح کا خواب تم نے دیکھا تھا، میں نے بھی دیکھا وقال لي رسول الله صلّى اللّٰه عليه وسلم! العلوية وبناتها عندک؟ قلت نعم يارسول الله! قال: القصرلک ولاهل دارک و أنت وأهل دارک من أهل الجنة. مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ علوی خاندان اور اُس کی بچیاں تمہارے گھر میں ہیں؟ میں نے کہا: جی ہاں یارسول اللہ! آپ نے فرمایا: یہ محل تمہارا اور تمہارے گھر والوں کا ہے اور تم اور تمہارے گھر والے جنتی ہیں۔ (الکبائر للذهبي: ص/٦٧، بحواله الدرالمنضد: ٤٧٤/١)

اِس واقعہ سے یہ نصیحت اور پیغام دیا گیا ہے کہ انسان کو اپنا دل دوسروں کے سلسلہ میں نرم رکھنا چاہیے، اور ضرورت مندوں کی زیادہ چھان بین کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے، بروقت اللہ نے جتنی مدد کی توفیق دی ہو کردینی چاہیے۔ بعض لوگوں کا مزاج بڑا سخت ہوتا ہے، وہ مانگنے والوں کو سخت سست کہہ دیتے ہیں۔ ہمیں زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں، اللہ کے نام پر جو مانگ رہا ہے حسبِ حیثیت اُسے دے دیں، ہمارا معاملہ مانگنے والے کے ساتھ نہیں؛ بلکہ ہمارا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، ہم خلوصِ نیت کے ساتھ مدد کریں، اللہ اُس مدد کے نتیجہ میں آفات وبلیات اور مصائب سے حفاظت فرمائیں گے اور کہاں کا خرچ انسان کے کہاں کام آجائے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ آج ہم نے کسی کے ساتھ خیر کا معاملہ کیا، دس سال کے بعد ہوسکتا ہے اُس کا صلہ کسی اچھی شکل میں برآمد ہو، کتنی آفتیں آزمائشیں اور پریشانیاں ایسی ہیں جو اِس طرح کے خیر کے کام کرنے کے نتیجہ میں انسان کی زندگی میں آنے سے پہلے ہی دُور ہوجاتی ہیں۔

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ

اچھے اخلاق اپنائیں، بُرے اخلاق سے بچیں

ازقلم: مولانا محمد عمرین محفوظ رحمانی صاحب، سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

حدیث شریف میں یہ بات آئی ہے کہ سب سے بُرے لوگ وہ ہیں جو چغلی کھاتے اور محبت کرنے والے لوگوں کے درمیان جھگڑا لگاتے ہیں اور بے قصور لوگوں کے عیب تلاش کرتے ہیں۔ یہ حدیث شریف بتاتی ہے کہ بُری عادتوں اور بُرے اخلاق کی وجہ سے انسان اللہ کی نگاہ سے گر جاتا ہے اور دنیا وآخرت کی بھلائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ بُرے اخلاق کی وجہ سے انسان کا دین اِسی طرح برباد ہو جاتا ہے جس طرح سرکہ شہد کو خراب کر دیتا ہے۔قرآنِ پاک کی آیتوں اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں جہاں اخلاق کی اہمیت اور فضیلت آئی ہے اور اس پر اجر وثواب کے وعدے ہیں وہیں بُرے اخلاق سے بچنے اور اُن سے دُور رہنے کی تاکید بھی آئی ہے، قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! زیادہ گمان نہ کیا کرو؛ اِس لیے کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور تجسس (دوسروں کی ٹوہ) میں نہ پڑو، اور تم سے کوئی شخص کسی کی غیبت نہ کرے۔ یہ سورۂ حجرات کی آیت ہے، اسی سورت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ کسی کو بُرے لقب سے نہ پکارو، کسی کا مذاق نہ اُڑاؤ، کسی کو لعن طعن نہ کرو۔ حدیثِ پاک میں اایا ہے کہ مومن طعنہ دینے والا اور لعنت کرنے والا نہیں ہوتا اور نہ وہ فحش گو اور بُری باتیں کرنے والا ہوتا ہے، یعنی مسلمان ان بُری عادتوں اور بُرے اخلاق سے پاک وصاف ہوتا ہے۔

آج کتنے مسلمان ایسے ہیں جو دوسروں کے درمیان جھگڑا لگاتے ہیں، چغلی کرتے ہیں، محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے دُور کرتے ہیں، غیبت سے اپنی زبان کو آلودہ کرتے ہیں، مسلمانوں کے معاشرے میں چل پھر کر دیکھیے کہ کتنے نوجوان ایسے ہیں جن کی زبانوں پر بُرے اور گندے الفاظ ہوتے ہیں، افسوس کہ فحش گوئی کو اب نہ عیب سمجھا جا رہا ہے اور نہ بُرائی، فلم اور سینما بینی نے نہ صرف لوگوں کے ذہنوں کو گندہ کیا ہے؛ بلکہ اُن کی زبانوں کو بھی خراب اور آلودہ کر دیا ہے؛ حالاں کہ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ پر انسان قیامت کے دن پکڑا جائے گا، حدیث شریف میں یہ بات آئی ہے کہ انسانوں کو منھ کے بل جہنم میں گرانے والی چیز اُن کی زبانوں کی کمائی ہے۔

بُرے اخلاق میں یہ بات بھی داخل ہے کہ انسان اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اپنے آپ تک محدود رکھے، جودوسخا کے بجائے بخل اور کنجوسی کی راہ پر چلے، اِسی طرح بے حیائی بھی بُرے اخلاق میں داخل ہے، بے حیا انسان گناہوں پر جرأت مند ہوجاتا ہے، اس کی سرکشی بڑھ جاتی ہے اور بُرے کاموں کی طرف وہ لپکتا چلا جاتا ہے، حدیثِ پاک میں ہے کہ جب تم میں سے حیا نکل جائے تو تم جو چاہو کرو۔ بُرے اخلاق اور بُرے کردار سے ہر قیمت پر بچنا چاہیے، بھلی باتیں اور اچھے اخلاق اپنانا چاہئیں، حدیثِ پاک میں یہ بات آئی ہے کہ قیامت کے دن انسان کے ترازو میں جو سب سے وزن دار چیز رکھی جائے گی وہ حسنِ اخلاق ہے، یعنی بھلی اور اچھی عادتیں۔ انسانوں کو یہ قوت دی گئی ہے کہ وہ اگر چاہ لیں تو اپنے اندر بہترین عادتیں اور اچھے اخلاق پیدا کرلیں اور اگر وہ غفلت سے کام لیں اور بُرائیوں کی طرف چل پڑیں تو پھر ناکامی اور نامرادی کے علاوہ کچھ ہاتھ آنے والا نہیں۔

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ

اساتذہ اور علما ماسوائے رب سے مستغنی رہیں

ازقلم: مفتی احمد اللہ نثار صاحب قاسمی، ناظم دار العلوم رشیدیہ وصدر دار الافتاء والارشاد حیدرآباد

دنیاوی ضروریات سے کوئی بے نیاز نہیں ہے؛ مگر خوش نصیب ہے وہ شخص جس کی روزی اللہ نے اُس کے دین میں رکھ دی ہے، باعزت طریقہ سے اللہ اُن کی دارین کو بخت آوار بنا دیتے ہیں۔

حضرت عبداللہ ابنِ مبارکؒ فرماتے ہیں: کتنے ہی اعمال بہت چھوٹے ہوتے ہیں؛ مگر اخلاصِ نیت اُن کو بڑا کر دیتی ہے، اور کتنے ہی اعمال بڑے ہوتے ہیں؛ لیکن نیت میں اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے وہ حقیر بن جاتے ہیں ”ربّ عمل صغير تكثّر النية ورب عمل كثير تصغّره النية“۔ (سیر اعلام النبلاء: ۴۰۰/۸)

خدمت سے محروم کر دیے جاتے تو؟

تعلیم وتربیت کے پیغمبرانہ شعبہ کی خدمت کس سعادت مندی ہے، اگر ہم بھی مزدوروں کی طرح بوجھ اُٹھانے، فیکٹری میں صفائی کرنے، ہوٹل پر چائے بیچنے میں لگا دیے جاتے تو کون پوچھنے والا تھا، ہمارے ساتھ کتنے ساتھیوں نے حفظ وعالمیت کی کوشش نہیں کی ہے؛ مگر آج وہ ہم پر رشک کرتے ہیں، ربِّ کریم نے ہمیں ہماری کمزوریوں کے باوجود اس مقدس خدمت سے جوڑے رکھا ہے، ہم نہ صرف زندگی بھر ایک مدرس، عالم، مفتی وغیرہ سے جانے جائیں گے؛ بلکہ صدقۂ جاریہ کا بہترین سامان تیار کرلیں گے؛ بلکہ ہمیں شاگردوں کا ممنون رہنا چاہیے کہ انھوں نے خود کو ہمارے سپرد کر دیا۔

اجرِ الٰہی میری محنت سے بہت زیادہ ہے:

حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے: ”میں دنیا میں سوائے نفس کے کسی سے نہیں ڈرتا“، نیت کب خراب ہو جاتی ہے، اخلاص کا دامن کب چھوٹ جاتا ہے، احساس بھی نہیں ہوتا۔ ؎

بگاڑ کر دین کو اپنا کہیں دنیا ہی بن جائے
نہ کچھ دین ہی رہا باقی نہ دنیا کے مزے پائے

یہ نہ سوچیں کہ میری تنخواہ میری محنت کے مقابلے میں کم ہے؛ بلکہ یہ سوچیں کہ اللہ کا انتخاب اور اس کا اجر میری محنت سے بہت بڑھا ہوا ہے۔

معاوضہ ضرورت ہے مقصود نہیں:

تدریس وخدمتِ دین پر معاوضہ لینا فی نفسہٖ جائز ہے، کسی درجہ کی کراہت نہیں ہے؛ مگر معاوضہ واُجرت کو مقصود بنا کر تدریس کرنا منع ہے؛ کیوں کہ معاوضہ ضرورت ہے نہ کہ مقصود اور ضرورت کو مقصود بنا دینے سے قلبِ موضوع لازم آتا ہے، علمائے کرام نے فرمایا ہے کہ: ''گانے بجانے سے دنیا کمانا اِتنا بُرا نہیں ہے جتنا قرآنِ پاک کی خدمت کے ذریعہ دنیا کمانا بُرا ہے، جو شخص علمِ دین کو دنیا کمانے کا ذریعہ بناتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ناقدرا اپنی داڑھی سے اپنے جوتے کے تلے کو صاف کرے۔

قناعت واستغنا کے بے مثال نمونے

زکریا بن عدی رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے شاگرد سے سرمہ قبول نہ کرنا:

زکریا بن عدی رحمۃ اللہ علیہ صحاح کے راویوں میں سے ہیں، آپ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ آپؒ کی آنکھیں دُکھنی آئیں، ایک شخص سرمہ لے کر حاضر ہوا تو پوچھا: کیا تم ان لوگوں میں ہو جو مجھ سے حدیث سنتے ہیں؟ اُس نے کہا: جی ہاں! فرمایا: پھر میں سرمہ کیسے لے سکتا ہوں؛ کیوں کہ حدیث سنانے کا معاوضہ ہو جائے گا۔

ابراہیم الحربیؒ کا استغناء:

ابراہیم الحربی باوجود یکہ زندگی فقر وفاقہ میں گزر رہی تھی، متعدد بار آپ کی خدمت میں خلیفۂ وقت معتضد باللہ نے بڑی بڑی رقمیں بھیجیں؛ مگر آپ نے قبول نہ کیا، قاصد سے ایک مرتبہ عاجز ہو کر کہا کہ: خلیفہ سے کہہ دو کہ ہم کو پریشان نہ کریں، رقم بھیجنا بند کریں؛ ورنہ ہم یہاں سے دوسری جگہ چلے جائیں گے۔

ابویعلیٰ جزری رحمۃ اللہ علیہ کی تدریسِ نیت:

ابویعلیٰ جزیرہ کے محدثین میں سے تھے، ابنِ حبانؒ، ابوحاتمؒ اور ابوبکر اسماعیلؒ جیسے نامور محدثین آپؒ کے شاگرد ہیں، آپؒ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب انتقال ہوا تو موصل کے تمام بازار بند ہو گئے، اپنی تصنیف وتالیف میں صالح نیت رکھتے تھے، حسبتاً للہ علمِ حدیث کی تعلیم میں مشغول رہتے تھے۔

شیخ الہندؒ اور حضرت خلیل احمد سہارنپوریؒ کی تنخواہ:

حضرت خلیل احمد سہارنپوریؒ کی تنخواہ عرصہ تک صرف چالیس روپیہ تھی، جب بھی انتظامیہ کی طرف سے

اضافہ کی بات آتی تو فرماتے: میری حیثیت سے یہ بھی زیادہ ہے، اضافہ کرنے سے منع کر دیتے، عرصہ کے بعد دیگر مدرسین کی جب چالیس روپیہ تک پہنچ گئی اور مزید اضافہ رُک گیا کہ صدر مدرس سے دوسروں کی تنخواہ بڑھ جائے گی، تو دیگر مدرسین کا خیال رکھتے ہوئے اضافہ قبول فرمالیا۔

یہی معاملہ شیخ الہندؒ کی تنخواہ کے وقت پیش آیا تھا کہ عرصہ تک پچاس روپیہ سے زیادہ کو قبول نہیں فرمایا؛ مگر دیر عملہ کا بھی اضافہ کیا گیا تو آپؒ نے بھی اضافہ قبول فرمالیا۔

حضرت معمر بن سلیمانؒ کے استغناء کا حیرت انگیز واقعہ:

حضرت معمر بن سلیمانؒ کو کسی کام سے بادشاہ کا تعاون درکار تھا، کسی نے کہا کہ بادشاہ سے مل کر اس کے متعلق گفتگو کرلیں تو بہتر ہے، فرمایا: میں ایک بار ملنے کا ارادہ کر کے اُٹھ گیا تھا؛ مگر معاً خیال آیا کہ اللہ نے جو علم اور قرآن کی دولت مجھے عطا کی ہے وہ بادشاہ کی ملاقات سے ہزار درجہ بہتر ہے، اسی علم و قرآن کے احترام میں بادشاہ کے پاس جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ (تہذیب التہذیب: ۱۰/۲۵۰)

کتنے اہلِ علم ہیں جو چند پیسوں کی خاطر سیٹھ کے بنگلے اور فیکٹری کا طواف کرتے ہوئے کہیں گیٹ پر تو کہیں سرونٹ کواٹر کے پاس انتظار میں کھڑے نظر آتے ہیں، حصولِ ثواب کے لیے وہ ہمارے پاس آنا نہیں چاہتے تو ہمیں حصولِ مال کے لیے جاتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی۔ یہ لوگ وہ تھے جو خواہشات کا گلا نہیں؛ بلکہ ضروریات کا گلا گھونٹ دیتے؛ لیکن دولتِ قرآن کو اصحابِ اقتدار کی چوکھٹ پر ذلیل کرنا گوارا نہ کرتے۔

مولانا یوصف صاحب بنوریؒ کا استغناء:

مولانا یوسف صاحب بنوریؒ فرماتے ہیں: ''میں کبھی سوچتا ہوں کہ خدانخواستہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مجھ پر خدمتِ دین کے سارے دروازے بند ہو جائیں تو میں کیا کروں گا؟ میں ایسا گاؤں تلاش کروں گا جہاں کی مسجد غیر آباد ہو، وہاں جا کر اپنے پیسوں سے ایک جھاڑو خریدوں گا اور مسجد کو اپنے ہاتھ سے صاف کروں گا، پھر خود اذان دونگا اور لوگوں کو نماز کی دعوت دوں گا، جب وہ مسجد آباد ہو جائے گی تو دوسری تلاش کروں گا اور وہاں بھی ایسا ہی کروں گا، یہاں تک کہ موت آجائے۔ (سب کے لیے، ابنِ غوری: ۲۶)

شیخ الحدیث زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا استغناء:

قاری صدیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: حضرت استاذی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی خدمت میں ڈھاکہ حیدرآباد سے کئی مرتبہ خطوط آئے، لوگوں نے باصرار بلانا چاہا اور آج کل (اُس دَور کی بات

ہے جب تنخواہ سودوسو ہوا کرتی تھی) کے حساب سے تقریباً تین ہزار ماہوار تنخواہ مقرر کی؛ مگر حضرت نے منظور نہ فرمائی اور یہ لکھ کر انکار کر دیا: ؎

صدقِ نیت سے اگر اس کی چمن بندی ہو
پھر رہے کیوں نہ وطن ملکِ سلیماں ہوکر
اب ہم اپنے لیے خود سود وزیاں سوچیں گے
ہم کو جینا ہی نہیں بندۂ احساں ہوکر

اور بغیر کسی معاوضہ کے جو کام تدریس وتالیف کا مظاہر علوم میں دے رہے تھے اُسی میں لگے رہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو"آپ بیتی"۔

حضرت قاری رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ کا استغناء:

حضرت قاری رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ کی درس کی پابندی ضرب المثل تھی، چالیس سال دَورِ تدریس میں کوئی ایک ناغہ بھی نہیں کیا، پھر وقتی ضرورت کے تحت مدرسہ سے جس قدر تنخواہ لی تھی وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے وہ پوری رقم مدرسہ کو لوٹا دی۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ کسی طالبِ علم کا ہدیہ قبول نہیں فرماتے، ایک طالبِ علم نے بِنا بتائے کچھ برتن گھر بھجوادیے، جب آپ کو پتہ چلا تو سخت ناراض ہوکر فرمایا: یا تو برتن واپس لے جاؤ یا اُن کی قیمت وصول کرلو۔ طالبِ علم نے بہت منّت سماجت کی اور وعدہ کیا کہ معاف کردیں آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا، بڑی مشکل سے آپ نے معاف فرمایا۔ (عشاقِ قرآن:۱۳۹)

اشراف کے بعد ہدیہ قبول نہیں:

حضرت مولانا وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: ایک صاحبِ دل عالم غریب وفاقہ کش کی خدمت میں ایک رئیس زادہ سبق پڑھا کرتا تھا، ایک روز صاحبزادے درس کے لیے حاضر ہوئے تو استاذ کے چہرے پر ضعف ونقاہت کے آثار نمایاں پائے، سمجھ گئے کہ کئی وقتوں کا فاقہ ہے، کھانا نہیں کھایا ہے، رئیس زادے گھر گئے اور عمدہ کھانے پکواکر حاضرِ خدمت ہوئے کہ تناول فرمالیں، استاذ نے خوش ہوکر دعائیں دیں؛ مگر کھانے سے یہ کہہ کر معذرت کردی کہ تم کو میرے فاقہ کا اندازہ ہوگیا تھا، جب تم یہاں سے رخصت ہوئے، اُسی وقت میں سمجھ گیا تھا کہ تم ضرور کھانا لاؤ گے، اس کے بعد میری طبیعت میں انتظار سا پیدا ہوگیا تھا، اسی کا نام

''اِشراف'' ہے اور حدیث میں اِشرافِ نفس کے بعد جو کچھ ملے اُس کے قبول کرنے سے ممانعت وارد ہے؛ اِس لیے باوجود سخت ضرورت کے معذور ہوں۔ رئیس زادے کی دانائی کہ اصرار بالکل نہیں کیا، دسترخوان اُٹھا کر چل دیے، استاذ نے تو یہی خیال کیا کہ واپس لے گئے؛ لیکن تھوڑی دیر کے بعد خوان لیے ہوئے پھر چلے آئے اور نہایت لجاجت سے عرض کیا کہ حضرت اب تو انتظار ختم ہوگیا تھا، اب قبول فرمالیجیے۔

خاک ڈالو لاکھ روپے پر:

حضرت مولانا فضلِ رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی ایک مرتبہ مجلس میں عشقِ الٰہی کا بیان نہایت جوش وخروش کے ساتھ کررہے تھے، ایک صاحب نے عرض کیا حضرت نواب صاحب رامپور فرمارہے تھے کہ ہمارے یہاں اس وقت کے تمام اہلِ فضل وکمال تشریف لاچکے ہیں، بس ایک حضرت مولانا فضلِ رحمٰن صاحب ابھی تک تشریف نہیں لائے ہیں، اگر وہ کبھی قدم رنجہ فرمائیں تو انھیں ایک لاکھ روپیہ نذر میں پیش کروں گا۔ حضرت نے بڑی بے نیازی کے ساتھ فرمایا کہ خاک ڈالو لاکھ روپے پر اور داستانِ عشق ومحبت سنو۔ (حیات مصلح الامت:۳۰۹)

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا استغناء:

حاجی امیر شاہ خاں (علماءِ دیوبند کے واقعات وحالات کے نہایت معتبر اور قوی الحفظ راوی) نے فرمایا کہ مولوی امیر الدین صاحب نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ بھوپال سے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی طلبی آئی اور پانچ سو روپیہ ماہوار (یاد رہے کہ یہ پانچ سو آج سے ڈیڑھ سو سال قبل کے ہیں) تنخواہ مقرر کی، میں نے کہا کہ اجی چلے کیوں نہیں جاتے، فرمایا کہ وہ مجھے صاحبِ کمال سمجھ کر بلاتے ہیں اور اسی بنا پر وہ پانچ سو روپیہ دیتے ہیں؛ مگر میں اپنے اندر کوئی کمال نہیں پاتا، پھر کس بنا پر جاؤں، میں نے بہت اصرار کیا؛ مگر نہ مانے۔ (ارواحِ ثلاثہ:۱۷۵)

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا استغناء:

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ پاکستان کے صفِ اوّل کے معماروں میں شامل تھے، قائدِ اعظم اور نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم تقسیمِ ملک کے وقت آپ کو اپنے ساتھ پاکستان لے آئے تھے اور مغربی پاکستان میں پاکستان کا پرچم سب سے پہلے مولانا ہی نے لہرایا تھا، اگر آپ چاہتے تو یہاں اپنے لیے بہت کچھ دنیوی ساز وسامان اور عہدہ ومنصب حاصل کرسکتے تھے؛ لیکن مولانا نے آخر تک درویشانہ زندگی گزاردی، اپنے لیے کوئی ایک مکان بھی حاصل نہ کیا؛ بلکہ وفات تک دو مستعار لیے ہوئے کمروں میں مقیم رہے اور اسی حالت میں دنیا سے تشریف لے گئے کہ نہ آپ کا کوئی بینک بیلنس تھا نہ ذاتی مکان تھا نہ ساز وسامان۔ (البلاغ مفتیٔ اعظم نمبر: ج ۱،ص ۲۸۰)

شیخ الاسلام حسین احمد مدنیؒ کے اخلاص کا عالم:

حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ دارالعلوم دیوبند سے تھوڑی سی تنخواہ پاتے تھے، تو بسا اوقات اس کا حوالہ دے کر روتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں تو دنیادار ہوں، حدیث پڑھا کر اتنی اتنی تنخواہ لیتا ہوں۔

(نمونے کے انسان:۲۳۹)

محدثِ کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کا استغناء:

محدثِ کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نوراللہ مرقدہٗ نے کچھ عرصہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حدیث کا درس دیا، وہاں یہ درس انھوں نے حسبتاً للہ دیا تھا، بعد میں جب یہ سلسلہ موقوف ہوگیا تو کچھ عرصہ کے بعد حضراتِ ندوہ کو معلوم ہوا کہ حضرت معاشی تنگی سے دوچار ہیں، انھوں نے اتنے دنوں کی معقول تنخواہ حساب لگا کر حضرت کی خدمت میں بھیجی۔ حضرت اُس وقت ضرورت مند تھے؛ لیکن یہ کہہ کر پوری رقم واپس کردی کہ میں نے پڑھانے میں یہ نیت کی تھی کہ محض اللہ کے واسطے پڑھاؤں گا۔ (نمونے کے انسان:۲۳۹)

مفتیٔ اعظم مفتی شفیع صاحبؒ کی تنخواہ:

دارالعلوم دیوبند میں مالی وسائل کی قلت کی وجہ سے اساتذۂ کرام کی تنخواہیں نہایت قلیل ہوتی تھیں، حیرت ہوگی کہ ابتداءً دارالعلوم میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو صرف پانچ روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا، اسی پر قناعت فرمائی، پھر رفتہ رفتہ مشاہرہ میں تھوڑا تھوڑا اضافہ ہوتا گیا، جب آپ ۲۶/سال کی جلیل القدر خدمات کے بعد دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوئے تو اُس وقت بھی مشاہرہ صرف ۶۵/روپے تھا، اس عرصہ میں دوسرے مدارس سے بڑی بڑی تنخواہوں پر بلانے کی مسلسل کوشش ہوتی رہی، مدرسہ عالیہ کلکتہ سے سات سو روپے مشاہرہ کی پیش کش بار بار کی گئی، جہاں کام بھی دیوبند سے کم تھا؛ مگر پیشِ نظر تنخواہ کبھی منظور نہ کی، دیوبند کی قلیل تنخواہ پر قناعت کی، مادرِ علمی کو چھوڑنا پسند نہ فرمایا۔ (البلاغ مفتیٔ اعظم نمبر: ج/۱، ص/۱۰۴)

میر عثمان علی خان کا واقعہ:

قاری حافظ فیض محمد اورنگ آبادی رحمۃ اللہ علیہ جید حافظ وقاری، عابد وزاہد اور مستغنی، اخیر زمانہ میں آنکھوں کے آپریشن سے آنکھوں پر پٹی باندھے ہسپتال کی پلنگ پر بیٹھے تلاوت میں مگن تھے، اتفاقاً حیدرآباد کے فرماں روا اعلیٰ میر عثمان علی خان صاحب نے عثمانیہ دواخانہ معائنہ کا کرتے ہوئے آپ رحمۃ اللہ علیہ کو سلام کیا، تلاوت میں

خلل ہونے کی وجہ سے ناگواری سے جواب دیتے ہوئے پوچھا: آپ کون ہیں؟ کہا: عثمان علی خان، پوچھا: کیا فرماں روائے دکن؟ جواب دیا ہاں! وہی، فرمایا: اگر آپ دکن کے فرماں روا ہیں تو آپ کو دوسروں کے معمولات میں مخل ہونے کا حق کیسے حاصل ہوگیا؟ میر اعلی کے ساتھ سارے امراء وڈاکٹر سکتے میں آ گئے، میر اعلی خاموشی سے چل دیے، معائنہ مکمل ہونے کے بعد دوبارہ حاضر ہوکر پوچھا: قاری صاحب! اب تو اپنے معمولات سے فارغ ہوگئے؟ مجھے مخل ہونے کا افسوس ہے، سنائیے کیا حال ہے؟ جواب دیا الحمدللہ! ٹھیک ہوں، دعا کی درخواست پر قاری صاحب نے ہاتھ اُٹھا کر دعا کی، جب چل دیے تو تعجب سے مصاحبین سے کہا: ایسے مستغنی لوگ اب بھی دنیا میں موجود ہیں، اِتنے عقیدت مند ہوئے کہ تاحیات معقول وظیفہ جاری رکھا۔

قرآن کی دولت کو پامال ہونے نہ دیا، اہلِ ثروت کے آگے پیشانی نہ جھکائی تو اللہ نے عزت دوبالا کردی، آج ہماری گلیوں میں قرآن خوانی اور آیتِ کریمہ کے بورڈس لگے رہتے ہیں، دنیا دار عوام وخواص نے قرآن کو بزنس بنالیا ہے۔ (عشاقِ قرآن، اسلم شیخو پوری صاحب)

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا استغنائے قلبی:

ایک روز حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی شخص نے آ کر اطلاع دی کہ حضرت آپ کے مکان کی چھت گر پڑی ہے، اطلاع دینے والے نے اس انداز سے خبر دی تھی کہ اس خبر کو سنتے ہی اُچھل پڑیں گے؛ لیکن حضرت اطمینان سے بیٹھے رہے، پھر انتہائی معصومیت کے ساتھ فرمایا: ''تو بھائی میں کیا کروں؟ جا کر کہو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (مہتمم دارالعلوم) سے؛ چناں چہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو اطلاع دی گئی اور انھوں نے کمرہ کی مرمت وغیرہ کرادی۔ (البلاغ مفتیٔ اعظم نمبر: ج۱/ص۲۵۲)

رشید احمد گنگوہیؒ کا استغناء:

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی خانقاہ عرصۂ دراز تک غیر آباد رہنے کے بعد آباد فرمائی، اس کے حجرہ میں درس وتدریس کا سلسلہ قائم فرمایا، ضرورت کے باعث ایک سہ دری بھی حجرہ کے سامنے تعمیر کرائی، شیخ کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے پیرزادوں میں بے چینی پھیلنے لگی، جلسے، گھر کے بیٹھکوں میں مشورے ہوئے کہ آج مولوی رشید احمد نے سہ دری بنوائی ہے، کل کو کچھ اور عمارت بنوا کر اپنی ملکیت کا دعویٰ کردیں گے، اُن کو اس مکان سے بے دخل کر کے جو کچھ لاگت اس تعمیر میں لگی ہے اُن کو دے کر قبضہ چھڑائیں؛ چناں چہ ایک بڑا مجمع پیرزادوں کا آپ کے پاس آیا۔

عام طور سے قبضہ چھوٹنا آسان نہیں ہوتا ہے، مخالفت ہوگی، لٹھ چلیں گے، دو چار سر پھوٹیں گے اور خدا جانے کیا کچھ ہوگا، حضرت مولانا کو کچھ خبر نہ تھی کہ مجمع نے یہ تکلیف کیوں اُٹھائی؟ کس غرض سے آئے؟ اُن میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر ان لوگوں کا منشا ظاہر کیا، اُس وقت آپ کو آنے والوں کا عندیہ معلوم ہوا اور آپ نے نہایت سادگی کے ساتھ جواب دیا کہ: ''بہت اچھا، اِتنی سی بات کے لیے مجمع کے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر کسی ادنیٰ آدمی اور اپنے یہاں کے نائی، دھوبی سے بھی یہ پیغام کہلا بھیجتے تب بھی مجھ کو چھوڑ دینے میں تامل نہ ہوتا، یہ فرما کر آپ نے تیس چالیس روپیہ جو کچھ بھی مکان کی لاگت میں جیبِ خاص سے خرچ کیے تھے، لے لیے؛ البتہ جو روپیہ چندہ سے اُس میں صَرف ہوا تھا وہ نہ لیا اور اُسی وقت طلبہ سے فرمایا کہ بستر، کپڑے اور لکھنے پڑھنے کا سامان، کتابیں وغیرہ سب نکال لو اور حجرہ خالی کردو۔ بعد میں اُن پیرزادوں نے بہت معافی مانگی اور دوبارہ تشریف آوری کی درخواست کی، جو حضرت نے قبول فرمالی۔ (تذکرۃ الرشید: ج۱/ص۹۷)

قاری ارادت الحق گیاوی رحمۃ اللہ علیہ کا سبق آموز واقعہ:

قاری ارادت الحق گیاوی رحمۃ اللہ علیہ ماہرِ تجوید وقرأت متقی و پرہیزگار، شہر کا کوئی حافظِ قرآن نہ تھا جس نے آپ سے استفادہ نہ کیا ہو، زندگی قرآن کی خدمت کے لیے وقت کردی تھی، کبھی تعلیم پر معاوضہ قبول نہیں کیا، جب کسی طالبِ علم کا قرآن ختم کرواتے تو رقّت طاری ہوجاتی، روتے ہوئے فرماتے: ''بیٹا! قرآن کو بیچنا مت''، آخر عمر تک تراویح سنانے کا اہتمام رہا؛ مگر کبھی بھی کسی بھی بہانے سے ہدیہ قبول نہ کرتے، جاننے والے آپ کے معمول کی وجہ سے ہدیہ پیش کرنا بھی بند کردیا تھا، اَنجان لوگ اگر پیش کردیتے تو سخت ناراض ہوجاتے، شہر کی جس مسجد میں معاوضہ نہ ملنے کی وجہ سے کوئی قرآن سنانے والا نہ ملتا تو اُس مسجد میں قرآن سنانے چل دیتے، رات بھر غیر آباد مساجد کو نوافل میں قرآن سے آباد رکھتے، مرض الموت میں سراپا قرآن بن گئے تھے، جدھر دیکھتے اُنہیں قرآن ہی نظر آتا تھا، کبھی کبھار کہتے: ''یہ میرے پیر کے نیچے قرآن کیوں رکھ دیے، ہٹاؤ، یہ بے ادبی ہے''، تسلی دینے کے لیے کہہ دیا جاتا کہ: ''آپ کے اُوپر بھی قرآن ہے اور نیچے بھی، اگر قرآن پر قرآن رکھا جائے تو کیا حرج ہے؟''۔

بلاتنخواہ پڑھانے والے:

حضرت استاذی قاری عبدالحمید صاحب نبیرہ راس المحدثین مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی بلاتنخواہ تعلیم دیتے تھے یہی حال اُن کے برادرِ خورد حضرت مولانا قاری عبدالحکیم صاحب کا تھا۔

حضرت مولانا فضلِ حق صاحب پانی پتی بلاتنخواہ طلبہ کو درس دیتے تھے، احقر (قاری صدیق) نے قدوری اور ہدایۃ النحو اُنہیں سے پڑھی ہیں۔

موجودہ زمانہ میں بلا تنخواہ پڑھانا ممکن ہے کمال شمار کیا جائے؛ مگر عادۃً آسان نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ترغیب دی جائے گی؛ بلکہ تنخواہ لینا ضروری ہے، مگر تنخواہ ہی کو مقصود بنانا بھی محلِ نظر ہے، تنخواہ کی وجہ سے خدمت کے موجودہ میدان سے دوسرے میدان کا انتخاب کر لینا؛ خواہ یہاں کتنی بھی ضرورت ہو، اپنے ملک کی تدریس کے بمقابل بیرونِ ممالک کی تدریس کو ترجیح دینا، اپنے محلّہ وبستی کی امامت کے بمقابل شہروں اور عربی ممالک کی امامت کو ترجیح دینا، جہاں خدمت جاری ہے وہاں دوسری جگہ محض تنخواہ کی زیادتی کی بنیاد پر چل دینا بہت افسوسناک بات ہے۔

چناں چہ حضرت قاری صدیق صاحبؒ لکھتے ہیں: ''آج کل عموماً علمِ دین پڑھانے والے ایسے حضرات ہوتے ہیں جن کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں ہوتا اور اگر کوئی ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے تو خدمتِ دین کماحقہٗ اَدا نہیں ہوسکتی؛ اِس لیے تنخواہ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں؛ لیکن اس کو مقصود نہ بنایا جائے، جس کی علامت (قاری صدیق) ذیل میں آرہی ہے''۔

کیا تنخواہ لینا دین فروشی ہے؟

ایک مرتبہ مولانا مرتضٰی حسن صاحب نے حضرت حکیم الامتؒ سے عرض کیا: حضرت! تنخواہ لینے میں میری طبیعت کو اُلجھن ہوتی ہے؛ کیوں کہ یہ تو صاف دین فروشی ہے، حکیم الامتؒ نے جواب دیا: ہرگز یہ دین فروشی نہیں، آج کل تنخواہ لینی چاہیے؛ کیوں کہ اس سے کام اچھی طرح ہوگا اور اس کا بار طبیعت پر رہے گا اور بدون تنخواہ لیے کام کا بار نہیں ہوتا۔ مولانا مرتضٰی حسن صاحب نے عرض کیا: تنخواہ لینے میں یہ تو مصلحت معلوم ہوئی؛ مگر اس ضرر کا کیا علاج ہے، اس میں دین فروشی ہے؟ اس کے جواب میں حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا: اس کی پہچان کہ دین فروشی ہے یا نہیں؟ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو ایک جگہ اتنی تنخواہ ملتی ہے کہ اس کے گذارہ کے لیے کافی ہے، پھر دوسری جگہ اس سے زیادہ تنخواہ مل رہی ہے، جس میں پہلی جگہ سے زیادہ دینی خدمت کی صورت نہیں ہے، تو اگر وہ پہلی جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جائے تو بے شک دین فروشی ہوگی۔

تنخواہ لینے سے متعلق مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

حضرت مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو جب ندوۃ العلماء کی تدریس ونظامت کی پیش کش کی گئی تو مشاہرہ لینے نہ لینے سے متعلق کافی تشویش ہوئی، تو قلبی اطمینان کے لیے حضرت شیخ الحدیث زکریا صاحبؒ نے فرمایا: مولوی صاحب! ضرور قبول کرلو اور مشاہرہ بھی لے لو اور نیت کرلو کہ چار چھ مہینہ وصول کرنے کے بعد چھوڑ دوں گا اور پھر بغیر مشاہرہ کے ہی پڑھاؤں گا، اگر شروع سے ہی مشاہرہ نہ لوگے تو طلبہ بھی قدر سے تمہاری بات نہیں سنیں گے اور مدرسہ والے سمجھیں گے ہم نے اس پر احسان کیا ہے کہ درسِ حدیث کے لیے مسند پر بٹھا دیا۔

نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ اس دَور میں دینی خدمت میں بھی دنیا مقصود ہوتی ہے، کم جا ایسے لوگ ملیں گے جو دین کی خدمت برائے دین کرتے ہوں؛ چناں چہ دیکھا جاتا ہیکہ ایک جگہ عمر کا ایک حصہ گذارنے کے بعد جیسے ہی زیادہ رقم کی جگہ ملتی ہے تو اس جگہ چلے جاتے ہیں، خواہ جہاں سے جارہے ہیں وہاں دین کا کتنا ہی نقصان ہوجائے اور جہاں جارہے ہیں وہاں کچھ بھی کام نہ ہوسکے۔

مفتیٔ اعظم مفتی شفیع صاحبؒ کا تنخواہ واپس کردینا:

دارالعلوم کراچی کی ابتدائی خدمات کے چار سال تک مفتی صاحب نے کوئی معاوضہ نہیں لیا، پھر جب بورڈ آف تعلیماتِ اسلام کی رکنیت ختم ہوگئی، کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا اور دارالعلوم کی خدمات شب وروز کا مشغلۂ زندگی بنی ہوئی تھیں، تو جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ سے مجلسِ منتظمہ کی درخواست پر پانچ سو روپے مشاہرہ لینا منظور فرمالیا؛ مگر شعبان ۱۳۷۷ھ سے اس م مشاہرہ میں از خود کمی کرکے صرف تین سو روپے ماہوار باقی رکھے، جس کا اکثر حصہ دارالعلوم کی ضروریات، ٹیلی فون کی آمدورفت اور مہمان داری میں خرچ ہوجاتا، پھر ۱۳۸۴ھ سے یہ تین سو روپے لینا بھی ترک فرمادیا۔ اس عرصہ میں جتنی رقم دارالعلوم سے بطورِ مشاہرہ وصول کی تھی، والد صاحب کی خواہش تھی کہ اس کو بتدریج واپس فرمادیں؛ چناں چہ متفرق اوقات میں مختلف عنوانات سے تقریباً ساڑھے بیالیس ہزار روپے دارالعلوم میں داخل فرمائے۔ (البلاغ مفتیٔ اعظم نمبر: ج ۱، ص ۲۱۳)

اپنا کتب خانہ دارالعلوم کے حوالے کردینا:

حضرت مفتی شفیع صاحب قدس سرہٗ نے اپنا واقعہ سنایا کہ دارالعلوم دیوبند کی ملازمت کے آخری سالوں میں بعض عوارض کی وجہ سے اُمورِ مفوضہ کے ادا کرنے کے لیے پورا وقت نہ دے سکتا تھا، کچھ کوتاہی ہوجاتی تھی، اور تنخواہ مجھے پوری مل جاتی تھی؛ مگر مجھے اس کا شدت سے احساس تھا، دارالعلوم سے علیحدہ ہوا تو مجھے بڑی فکر ہوئی کہ مدرسہ کا حق میرے ذمہ ہے، اس کے ادا کرنے کی کیا صورت ہو؟ اس وقت میرے پاس زائد سرمایہ بھی نہ تھا جو مدرسہ میں داخل کردیتا، ہاں ایک ذاتی کتب خانہ کافی مالیت کا تھا، وہ میں نے مدرسہ میں داخل کردیا اور مدرسہ کے حق سے سبک دوش ہوا اور اس کی مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ (البلاغ مفتیٔ اعظم نمبر: ج ۲، ص ۱۰۸۴)

موجودہ زمانہ میں کیا تنخواہ کی واپسی آسان ہے؟

مرتّب کا خیال ہے کہ: ''موجودہ زمانہ میں ہم مدرسین میں ہر کسی کو تنخواہ کی واپسی کا موقع شاید میسر نہ ہو؛ چناں چہ اکابرین میں بھی ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں؛ البتہ ہم اپنی اولاد کو فیس دے کر پڑھوانا، اپنی تعلیمی فیس کسی

وجہ سے والدین ادا نہ کر سکے تو اُس تعلیمی فیس کی واپسی کا نظم بنالینا، اگر اپنی تعلیم ادارہ باقی نہ رہا یا اعتماد نہ رہا تو کسی بچہ کی کفالت اس نیت سے لینا کہ میری تعلیمی فیس اس بہانے سے ادا کر رہا ہوں تو بھی ان اکابر کی جوتیوں کے صدقہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی مخلصین میں شمار فرما کر ان کے ساتھ حشر فرما دے''۔

تنخواہ کی کمی کی وجہ سے خیانت کی شکلیں:

آج کل مدارس میں ایک ادارہ سے دوسرے ادارہ کو تنخواہ کی وجہ سے منتقل ہونے کے واقعات گو کہ کم پیش آتے ہوں؛ مگر ایک ہی ادارہ کو بنیاد بنا کر وہاں سے دوسرے اداروں اور مساجد میں ایسے رابطہ قائم کر لیے جاتے ہیں کہ آمدنی کے جہاتِ ستہ منکشف ہو جائیں، ہر جہت کا حق کیا خاک ادا ہوگا، جس کو بنیاد بنایا تھا اُسی ادارہ کے طلبہ کے ساتھ خیانت، بغیر مطالعہ کے پڑھانا، سطحی و رسمی تدریس پر مطمئن ہو جانا، ضائع ہونے والی بے فیض قدامت کو باعثِ رعایت شمار کرنا، مدرسہ کے اوقات میں باہر کے کاموں کی ترتیب بنانا، مدرسہ میں ہوتے ہوئے درس گاہ میں سبق پڑھانے کے بجائے خارجی مصروفیات کی تھکان دُور کرنا، وقفہ کے وقت استراحت کے بجائے مزید مصروفیت سر لے کر اوقاتِ کار میں استراحت کرنا یا دیر حاضری کا عادی ہو جانا، یا میقاتِ ثانی میں سست بن جانا، اوقاتِ مدرسہ میں درسِ قرآن و درسِ حدیث کا مطالعہ کرنا، مدرسہ کی کتابوں سے دیگر اداروں کی تدریس کے لیے تیاری کرنا وغیرہ خیانات تو خیانت ہی شمار نہیں کی جاتی ہیں؛ نیز ادارہ سے جُڑی نسبت کا غلط استعمال کر لینا، عوام سے قرضے لینا یا ادارہ کے معاونین کو ذاتی خدمات کی طرف مائل کرنا بھی وقت کا تقاضا سمجھا جانے لگا ہے۔

اخلاص کے ساتھ استخلاص بھی ضروری ہے:

یکسوئی کے بغیر ماہر عالم نہیں بنا جا سکتا، آج جہاں طلبہ یکسوئی سے محروم ہوتے جا رہے ہیں وہیں اساتذۂ کرام بھی یکسو ہونا نہیں چاہتے، ''اَلْعِلْمُ لَایُعْطِیْکَ بَعْضَهٗ حَتّٰی تُعْطِیَهٗ کُلَّکَ'' (علم اُس وقت تک تجھے اپنا تھوڑا سا حصہ بھی نہ دے گا جب تک تو اپنے آپ کو پورا اُس کے حوالہ نہ کر دے)۔ جو دل مختلف فکروں میں بٹا ہوا ہو اُس کی مثال کھیت کی اُس نالی کی طرح ہے جس کی ڈول بنی ہوئی نہ ہو، اُس کے پانی کا کچھ حصہ اِدھر اُدھر چلا جائے گا، کچھ ہَوا بن کر اُڑ جائے گا، کچھ حصہ کو زمین جذب کر لے گی، صرف تھوڑا سا پانی رہے گا جو کھیت کے لیے کار آمد نہ ہو سکے گا۔ آج سالوں تدریس کرنے کے بعد بھی ماہرِ فن نہیں بن پانے کی وجہ یہی ہے کہ یکسوئی کے بغیر رسمی تدریس پر اکتفا کیا جانے لگا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب تم کسی کام میں لگو تو پورے طور پر اُس میں منہمک ہو جاؤ ''إِذَا كُنْتَ فِيْ أَمْرٍ فَكُنْ فِيْهِ''۔

حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ہم نے بکثرت دیکھا ہے کہ جوطلبا واساتذہ مسکن وملبس کی تزئین میں منہمک رہتے ہیں وہ کمال سے محروم رہتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا منشاومقصود میں انہماک تھا، جب توجہ تزئین کی طرف ہوئی تو مقصود میں مشغولی نہ ہوگی، اس کے لیے حرمان لازم ہے۔

(مواعظ حکیم الامتؒ)

خیانت کی ایک شکل مدرّسی سے مہتممی تک:

جس ادارہ میں سالوں سے مصروفِ خدمت ہیں وہاں ایسے عوارض پیش نہ بھی آئیں جس سے ہمیں یکسو ہونا پڑے پھر بھی راحت طلبی وجاہ طلبی کا عادیہ ایسا بھڑک اُٹھتا ہے کہ اہل ہو یا نااہل، ناظم ومہتمم بننے کو ترجیح دیا جاتا ہے، تدریس ترک کر کے مستقل ادارہ کی فکر ومحنت شروع کر لی جاتی ہے، طلبہ واساتذہ اجتماعی طور پر ادارہ کے طلبہ کی ذہن سازی کر کے بالمقابل مدرسہ قائم کر لیتے ہیں، کہیں ادارہ کے معاونین کا ذہن بگاڑ کر اپنے نومولود ادارہ سے مربوط کر لیتے ہیں، کہیں ادارہ کے طلبہ کو اپنے مکتب کی ترغیب دے کر ادارہ کے نظام کو غیر محسوس طریقہ سے کمزور کر دیتے ہیں۔

تنخواہ کی کمی سے کالج کی ملازمت:

دارالعلوم دیوبند کے ایک انتہائی ممتاز مدرس حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد بھی تھے، اُن کو کسی کالج کی طرف سے اچھی تنخواہ پر مدرسی کی پیشکش ہوئی، انہوں نے حضرت شیخ الہندؒ سے ذکر کیا کہ حضرت! ہم یہاں دارالعلوم میں آٹھ آٹھ، دس دس گھنٹے پڑھاتے ہیں، باقی وقت مطالعہ میں گزر جاتا ہے، تصنیف وتالیف یا وعظ وخطابت کے لیے وقت بہت کم ملتا ہے، خیال ہے کہ کالج میں تدریس کا وقت بہت کم ہوگا اور باقی فارغ وقت میں تصنیف وتالیف اور دوسری دینی خدمات کا زیادہ موقع ملے گا؛ اِس لیے یہ رجحان ہے کہ اس پیش کش کو قبول کر لیا جائے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اس رائے کی مخالفت کی اور فرمایا کہ مولوی صاحب! مجھے اُمید نہیں ہے کہ وہاں جا کر آپ اِتنی دینی خدمات بھی فارغ اوقات میں انجام دے سکیں جتنی یہاں ہو جاتی ہیں؛ لیکن یہ بات اُن کی سمجھ میں نہ آئی کہ زیادہ فرصت اور فراغت کے باوجود کام زیادہ کیوں نہیں ہو سکے گا؟ حضرت کی رائے تو نہ تھی؛ لیکن اُن کی شدید خواہش دیکھ کر اجازت دے دی، تقریباً ایک سال کے بعد چھٹیوں میں وہ دیوبند آئے اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت نے سلام اور دریافت خیریت کے بعد پوچھا:

’’کیوں مولوی صاحب! اس عرصے میں آپ نے کتنی تصنیف کی؟ کتنے فتوے لکھے؟ کتنے وعظ کہے؟‘‘، یہ

سن کر وہ صاحب رو پڑے اور کہا کہ حضرت! حساب وکتاب کے نقطۂ نظر سے تو آپ کی بات سمجھ میں نہ آتی تھی؛ لیکن تجربہ سے سمجھ میں آ گئی، واقعہ یہ ہے کہ جتنا کام دار العلوم میں عدیم الفرصتی کے باوجود ہو جاتا تھا وہاں فرصت کے باوجود اُتنا نہ ہوا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر: ج/۱، ص/۲۳۶)

ایسی احسان فراموشی نہ ہو:

ایک ادارہ میں ایک مولوی صاحب ادارہ کے تمام احسانات (جہاں تنخواہ کے علاوہ اَمراض وقرض وغیرہ میں معتد بہ رقم اپنائیت ومعاونت اخلاقی فریضہ کے طور پر شامل رہی) فراموش کرتے ہوئے درمیانی سال عوامی وعمومی دینی خدمت کرنے کے نام پر تدریس چھوڑ کر کمپنی کے ملازم بن گئے، محض تنخواہ کی خاطر یہ تک نہ سوچا کہ درمیان سال نکلنا طلبہ کے حق میں کس قدر نقصان دہ ہے، ہم ایامِ طالبِ علمی کا حق اُن اداروں کو کیا خاک حق ادا کریں گے؟ افسوس کہ فراغت کے بعد اپنے مادرِ علمی کے احسانات یاد رکھنا تو دُور اپنی موجودہ صلاحیت کو ذاتی سمجھتے ہیں نہ کہ ادارہ اور اساتذہ کی محنتوں کا نتیجہ؛ چناں چہ یہی عادت بطورِ ورثہ کے طلبہ میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔

تنخواہ حلال کرنے کے لیے کام نہ کریں:

سابق ناظم جمعیت علماءِ ہند حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ فرماتے ہیں: جو کام جس درجہ اہم وضروری ہوتا ہے اور جس کی منفعت عام وہمہ گیر ہوتی ہے اُس کی ادائیگی میں اگر سستی وکوتاہی کی جائے تو اُس کا وبال بھی اُتنا ہی زیادہ ہوتا ہے؛ لہٰذا اِس عظیم الشان بنیادی خدمت میں اگر آپ خدانخواستہ لاپرواہی برتتے ہیں اور اِس کوشش کو خانہ پُری کے طور پر انجام دیتے ہیں؛ تاکہ آپ کی تنخواہ واجب ہو جائے تو ظاہر ہے کہ آپ نہ صرف اِن بچوں کے حق میں خیانت کر رہے ہیں؛ بلکہ آپ پوری ملت وپوری نوعِ انسانی کے حق میں خیانت کر رہے ہیں؛ بلکہ ساری مخلوق کی نظر میں آپ مجرم بن رہے ہیں اور بہت بڑی تباہی کا بار آپ اپنے سر لے رہے ہیں۔
(مسئلۂ تعلیم، طریقۂ تعلیم: ۸)

حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب پانی پتیؒ کی محنت کا عالم:

حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب پانی پتیؒ بعد نمازِ فجر سے مسلسل عصر تک اور کبھی مغرب تک درس دیتے، کسی دن دوپہر کو آرام کا موقع مل جاتا، ہر فن میں عبور تھا، دوسرے مقامات سے بڑی بڑی تنخواہوں پر بلایا جاتا تھا؛ مگر "مدرسہ عربیہ گنبدان پانی پت" کو چھوڑ کر کہیں تشریف نہیں لے گئے اور ۲۵/روپیہ مشاہرہ پر زندگی گزار دی۔

مولوی سیّد امین الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تنخواہ:

حضرت اقناذی ماموں مولوی سیّد امین الدین صاحب جن سے احقر (قاری صدیق) نے کئی پارے حفظ کیے، فارسی اور عربی کی کچھ ابتدائی کتابیں بھی پڑھی ہیں، ہمہ وقت تعلیم میں مصروف رہتے، تنخواہ دس روپے تھی، وہ بھی ہر ماہ نہیں ملتی تھی، اللہ پاک نے ایسی برکت عطا فرمائی تھی کہ اس مختصر رقم میں اپنے اخراجات کے علاوہ دوسروں کی بھی امداد کرتے رہتے تھے، مہمانوں کی آمد کا سلسلہ بھی برابر رہتا تھا۔

حضرت مولانا عبدالغنی صاحب پھول پوری رحمۃ اللہ علیہ کی محنت:

حضرت مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ خلیہ حکیم الامتؒ ابتدائی دَور میں اپنی ذاتی رقم سے محنت کرنے لگے، لوگوں نے پھر بھی یہاں تک ستایا کہ آخر ترکِ وطن کرنا پڑا، اعظم گڑھ کے ''تحصیل پور'' میں رہنے لگے اور جب مدرسہ قائم کیا تو حضرت کے پاس کچھ نہیں تھا، ۸-۱۰ رفٹ کا ایک گڑھا کھود کر اُس میں بال بچوں کو لے کر رہنے لگے، دوپہر کو اُس کے اُوپر چٹائی ڈال دیتے، پیشاب پاخانے کے لیے کھیت میں چلے جاتے، جب بارش ہوتی گڑھے میں پانی بھر جاتا تو قصبہ میں جا کر پناہ لیتے، اِس طرح ابتدائی دَور میں کام ہوا، پھر اللہ نے آپؒ کے ہاتھ پر عالمی شخصیات کو بنایا، ظاہر ہے ابتدا ہی سے قالین نہیں بچھائے جاتے، اکابر کے نام لیوا اُن کی فتوحات چاہتے ہیں؛ مگر اُن کے مجاہدات کرنا نہیں چاہتے۔ (سب کے لیے، ابنِ غوری:۲۴)

حضرت مولانا عبدالقوی صاحب دامت برکاتہم کی محنت:

حضرت مولانا عبدالقوی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: ''حضرت محی السنہؒ جوانی میں گاؤں گاؤں جا کر محنت کرتے، لوگوں کو دین سمجھاتے، ہاتھوں میں چھالے اور پاؤں میں آبلے ہو جاتے، اِس قربانی کے بعد بدعت ختم ہو کر سنت زندہ ہوئی''۔ حضرت محی السنہؒ فرماتے ہیں کہ: ''میں کبھی کسی پر بوجھ نہیں بنا، کبھی اُبلے چنے وغیرہ رکھ لیتا، وہی کھا لیتا، کسی پر دعوت وضیافت کا بھی بوجھ نہیں بنتا''، تبھی اپنے بڑوں کا اِتنا اعتماد حاصل تھا کہ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے آپؒ کے متعلق فرمایا تھا کہ: ''اگر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن یہ پوچھے کہ کیا لائے ہو، تو مولانا ابرارالحق صاحب کو پیش کر دوں گا''۔ کیا شان ہوگی ایسے شاگردوں کی، کہ جنھیں ان کے استاذ و شیخ اپنی نجات کا ذریعہ سمجھیں۔

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ

بدگمانی کے دینی ودنیاوی نقصانات

مولوی محمد عبداللہ سلّمہٗ، متعلّم دارالعلوم دیوبند

آج کل کی دنیوی، علمی اور صنعتی ترقی نے انسانی زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں جو حیرت انگیز صنعتی انقلاب پیدا ہوگیا ہے، اُس نے تاریکیوں کو روشن اور مشکلات کو آسان بنا کر عرصۂ گیتی کو دریاؤں کی گہرائی سے لے کر اَوجِ فضا تک جولان گاہ بنا دیا ہے؛ لیکن اِس علمی ترقی اور تمام ترقوتوں وافکار کے ماڈی مسائل پر مرکوز ہوجانے کے باعث، ایمان وتقویٰ، یکجہتی و بھائی چارگی کی بنیادیں بالکل کھوکھلی سی ہوگئی ہیں، وحشت ناک مفاسد کا ایک معاشرے کے ہر پہلو میں پیدا ہوگیا ہے، جنایات وجرائم کا بازار گرم ہوگیا ہے، معاشرہ کی اصلاح وسعادت کے اسباب نے فساد وبدبختی کے مقابلہ میں اپنے گھٹنے ٹیک دیے ہیں اور روحانیت کے بچے کھچے اجزاء بھی نفسانی خواہشات کے شعلوں میں جل کر خاک ہوگئے ہیں۔

جھوٹ، حرص، نفاق ستم گری، جاہ طلبی، حسد، کینہ اور بدگمانی وغیرہ نے سعادت وخوش بختی کے سامنے، مضبوط بندھ باندھ دیے ہیں، پورے معاشرے کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اتحاد کے رشتوں کی شکستگی، انفرادی واجتماعی بے چینی، مختصر یہ کہ ہر قسم کی بختی نے معنویت وروحانیت کا خاتمہ کر دیا ہے۔

بدظنی وبدگمانی:

جو انتہائی خطرناک قسم کی روحانی بیماری ہے، بہت سی ناکامیوں، بربادیوں اور مایوسیوں کا سرچشمہ ہے، یہ ہماری عام بیماری ہوگئی ہے؛ نیز یہ ایک ایسی بیماری ہے جس کے باعث انسان کی روح مسلسل عذاب میں مبتلا رہتی ہے۔

رنج وغم ہی وہ مرکزِ احساس ہے، جہاں سے ممکن ہے کہ بدگمانی کا آغاز ہوتا ہوا اور احساسات وجذبات میں ایک شرکیہ انقلاب وطوفان کا سبب بنتا ہو، بدگمانی کا بیج ناگوار وتلخ اثرات مرتب کرتا ہے، جس کا آئینۂ روح بدگمانی کے غبار سے کثیف اور تاریک ہو چکا ہو، اُس کے سبب محض وہی نہیں کہ آفرینش کی خوبیاں وزیبائیاں اُجاگر نہیں ہوسکتیں؛ بلکہ سعادت اور خوش بختی اپنی صورت بدل کر ملال واضملال بن کر ظاہر ہوئی ہیں اور ایسا شخص کسی بھی انسان کے کردار وافکار کو بے غرض تصور نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبِ اسلام جو کہ پیار ومحبت اور امن و بھائی چارگی کا پیغامبر ہے،

بدگمانی کو بہت بڑا گناہ شمار کرتا ہے اور مسلمانوں کو اِس بات سے روکتا ہے کہ ایک دوسرے کے بارے میں بدگمانی کریں۔ارشادِ ربانی ہے:﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ الخ﴾ (الحجرات:۱۲)(اے لوگو! جو ایمان لا چکے ہو بہت سی گمان کی باتوں سے بچو، کہ بعض گمان گناہ ہے، تجسس میں نہ پڑو اور نہ تم میں سے ایک شخص دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی شخص اِس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، جسے تم ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والے اور مہربان ہیں)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اپنے آپ کو بدگمانیوں سے بچاؤ''؛اس لئے کہ بدگمانی سے جو بات کی جائے وہ سب سے زیادہ جھوٹی ہوتی ہے اور دوسروں کے معاملات میں معلومات مت حاصل کرتے پھرو اور ٹوہ (عیب ڈھونڈنے والے) میں مت رہو اور نہ آپس میں تکرار کرو، نہ ایک دوسرے سے بغض رکھو، نہ ایک دوسرے سے قطع تعلق کرو، اللہ کے بندے بنو اور آپس میں بھائی بھائی بن کر زندگی گزارو۔(صحیح بخاری، حدیث نمبر:۶۰۶۴)

قالَ أبو حاتمؒ: الواجب العاقل لزوم السلامة بترک التجسس عن عیوب الناس مع الاشتغال باصلاح عیوب نفسه، فإن من اشتغل بعیوبه عن عیوب غیره اراح بدنه، ولم یتعب قلبه، فکلما اطلع علیٰ عیب لنفسه هان علیه مایری مثله من أخیه، وإن من اشتغل بعیوب الناس عن عیوب نفسه عَمِيَ قلبه وتعب بدنه، وتعذر علیه ترک عیوب نفسه وإن من أعجز الناس من عاب الناس بمافیهم واعجز منه من عابهم بما فیه من عاب الناس عابوه.

ابنِ حبانؒ نے ابوحاتمؒ سے روایت بیان کی ہے کہ عقل مند پر بدگمانی کو ترک کرنا لازم ہے لوگوں کے عیوب سے، مشغول رہنا اپنے عیوب کی اصلاح کے ساتھ؛ اس لیے کہ جو اپنے عیوب کو چھوڑ کر دوسروں کے عیوب پر نظر رکھتا ہے اُس کا دل اندھا ہو جاتا ہے اور اُس کا جسم تھک جاتا ہے اور اُس کے لیے اپنے عیبوں کو درست کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور لوگوں میں سب سے کمزور وہ ہے جو لوگوں کی عیب جوئی کرے۔ (ابنِ حبان روضۃ العقلاء:ص/۱۲۹)

خلاصہ: بدگمانی ایک ایسا ناسور ہے جس نے بہت سے لوگوں کے درمیان نفرت کی خلیج پیدا کی ہے، رشتہ داریاں اور قرابت مندیاں فاصلوں میں بدل گئی ہیں؛ لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ایسے نازک حالات میں اپنے گمانوں کو صاف رکھیں اور سوچ کو پاکیزہ بنائیں۔مزید یہ کہ ہم بدگمانی سے محفوظ رہیں اور دسروں کو بھی بدگمانی سے بچنے کی تلقین کریں۔ربِ کریم سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام امتِ مسلمہ کو بدگمانی سے محفوظ رکھے۔آمین۔

اصلاحِ معاشرہ

عقیدہ کی اہمیت اور تحفظ

ازقلم: مولوی محمد عمر فاروق سلّمہٗ، متعلّم ندوۃ العلماء

موجودہ دَور الحاد ولادینیت، بدعات، مادّہ پرستی اور سائنسی ترقی کا دَور ہے جس کے نتیجے میں نِت نئے مسائل، نِت نئے فتنے اور گمراہ کن نظریات وعقائد بکثرت جنم لیتے رہتے ہیں، جن میں بعض نظریات اور فتنے اِتنے مہلک اور زہر آلود ہوتے ہیں کہ وہ ایمان وعقیدہ کو بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں اور انسان ضلالت وگمراہی کے سمندر میں جا گرتا ہے، اِسی وجہ سے جہاں انسان اپنی دنیاوی ترقی اور برّی وبحری فتوحات پر نازاں ہیں ایک صحیح العقیدہ اور سلیم الفطرت انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کی بھی فکر کرے، اور ایک مومن کے لیے تو صحیح ومعتبر عقیدہ کے سوا چارہ ہی نہیں کہ اس کے سارے دین واسلام کی بنیاد اسی عقیدہ پر قائم ہے اور افعال واقوال کی درستگی ومقبولیت کا دارومدار بھی عقیدہ کی صحت پر ہے۔

إن العقائد كلها أس لإسلام الفتي

إن ضاع واحد من بينهم فقد غوي

تمام عقائد انسان کے اسلام کی بنیاد ہیں، اگر ان میں سے ایک چیز بھی ضائع ہوجائے تو انسان گمراہ ہوجاتا ہے، صحیح عقیدے سے انحراف ہلاکت وبربادی کا پیش خیمہ ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ انبیاء جیسی معصوم اور مرکزی شخصیات کو بھی سختی سے متنبہ کیا گیا کہ عقیدے میں خرابی قطعاً ناقابلِ قبول ہے ﴿وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ○﴾ (اور بے شک تمہاری طرف اور تم سے اگلوں کی طرف یہ وحی کی گئی ہے اگر تو نے شرک کیا تو ضرور تیرا ہر عمل برباد ہوجائے گا اور ضرور تو خسارہ پانے والوں میں سے ہوجائے گا۔

ایک خوش حال زندگی کی راہ بھی ایک صحیح عقیدہ ہی ہموار کرتا ہے، صحیح عقیدہ کے بغیر انسان شکوک وتوہمات کا شکار ہوجاتا ہے، جس سے اس کی خوش حال زندگی کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، حتیٰ کہ اس پر زندگی کا دائرہ تنگ ہوتا چلا جاتا ہے، وہ چند دائروں میں محصور ہوجاتا ہے اور پھر یہ ہوتا ہے کہ اس کی ساری زندگی اس تنگ دائرہ سے راہِ فرار کی تلاش میں صَرف ہوجاتی ہے۔

زندہ جاوید معاشرہ کی تشکیل بھی عقیدہ کی درستگی ہی سے ممکن ہے، جس معاشرہ کی بنیاد صحیح عقیدہ اور واحدانیتِ الٰہ پر نہ ہو ہزار ہا مادّی اسباب ووسائل کے باوجود وہ معاشرہ ہلاکت وبربادی سے دوچار ہوتا ہے، جہاں خدائی قدروں کا اہتمام ہوتا ہے اور نہ انسانی قدروں کی وہاں کوئی جھلک ہوتی ہے اور نہ ہی حلال وحرام سے اُس معاشرہ کا کوئی واسطہ ہوتا ہے۔

یہ دینِ اسلام کا امتیاز ہے کہ اس اپنی آمد پر پوری دنیا اور دنیا کے معاشروں کو سب سے بڑی جو سوغات پیش کی وہ صحیح اور سالم عقیدہ کی تھی، اسلام کی آمد سے قبل بہت سے ادیان ومذاہب رائج تھے؛ لیکن کسی کے پاس بھی صحیح اور پختہ عقیدہ کی وہ طاقت نہیں تھی جس سے معاشرہ کے مہلک امراض سے نبرد آزمائی کی جاتی ہے، اسلام نے اپنی پختہ عقیدہ کی طاقت وقوت کے بل بوتے پر معاشرے میں رائج تمام تر عقائد فاسدہ اور مہلک امراض پر قدغن لگادی، تمام بدعات وخرافات کا قلع قمع کردیا، انسان کے دوشِ ناتواں سے طوق وسلاسل کے بوجھ کو اُتار پھینکا۔

لفظِ عقیدہ کی تشریح:

لفظِ ''عقیدہ'' کا مادّہ ''ع،ق،د'' ہے اور یہ عقدالحبل (رسّی کو گرہ دینا) سے مشتق ہے، المنجد میں یوں وضاحت ہے:''**العقيدة ج العقائد، ماعقد عليه القلب والضمير** (وہ بات جس پر دل ودماغ پختگی سے قائم ہے)۔

(۲)**ماتدين به الإنسان واعتقده.**

''جس کو انسان اپنا دین سمجھے اور اُس کا اعتقاد رکھے''۔

المعجم الوسیط میں عقیدہ کی تعریف یوں ہے:

(۳)**العقيدة الحكم الذى لايقبل الشک فيه لدي معتقده.**

''عقیدہ وہ حکم ہے جس میں اس کا معتقد شک کو قریب بھی آنے نہیں دیتا''۔

حضرت علامہ سیّد سلیمان ندوی مرحوم فرماتے ہیں:

''انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمراں ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے''۔

صحیح عقیدہ کا مفہوم:

صحیح عقیدہ وہی ہے جو قرآن وحدیث سے ثابت ہے اور اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے اور قرآن وسنت

کے مطالعہ وتتبع اور اہلِ سنت والجماعت کے عمل سے اس عقیدہ کو پرکھنے کے چھ اُصول ثابت ہیں: ایمان باللہ، ایمان بالملائکہ، ایمان بالکتب، ایمان بالرسل، ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالقدر۔

قرآن وحدیث سے یہ اُصول ثابت ہیں، سورۂ نسا میں اِن کا ذکر اِس طرح ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ، وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ (۱۳۶)

''اے ایمان والو! اللہ اور اُس کے رسول پر اور اُس کی کتاب پر جو اُس نے اپنے رسول پر اُتاری اور اُس کتاب پر جو اُس سے پہلے نازل کی (ان سب پر ہمیشہ) ایمان رکھو اور جو اللہ اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے رسولوں اور قیامت کو نہ مانے تو وہ ضرور دُور کی گمراہی میں جا پڑا''۔

حضرت امامِ مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں سیّدنا عمر ابنِ خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ روایت نقل کی ہے جس سے ان اُصولوں پر روشنی پڑتی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کی بابت سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''أَنْ تُـؤْمِـنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ''.

''ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر، اُس کے رسولوں پر اور یومِ آخرت پر ایمان لاؤ اور اِس بات پر ایمان لاؤ کہ اچھی بُری تقدیر صرف اللہ کی طرف سے ہے''۔

باقی جتنے بھی عقیدے متعلق امور ہیں وہ سب انہی چھ اُصولوں کے ذیل میں آتے ہیں، اگر بنیاد پختہ ہے اور اُصولوں پر مبنی ہے تو قوی اُمید ہے کہ انسان زیغ وضلالت کی وادیوں میں بھٹکنے سے محفوظ ہو جاتا ہے، دنیا کے ندر جتنے بھی مذاہب، ادیان اور فرقے اِس وقت موجود ہیں اُن سب کے بطلان کا سبب یہی ہے کہ ان کے نظریات واعتقادات کی بنیاد مندرجہ بالا اُصولوں پر نہیں ہے؛ لہٰذا اِس پُرفتن اور مادّہ پرست دَور میں ملتِ اسلامیہ کے افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کی فکر واصلاح کے لیے اُٹھیں، آج امتِ مسلمہ کا جو سب سے بڑا المیہ ہے وہ یہی ہے کہ امت کے ایک بڑی جماعت اصل عقائد سے کہ جن کے اردگرد ساری اسلامی تعلیمات گردش کرتی ہیں یکسر غافل ہو چکی ہے، مسلم گھرانوں میں بچوں کو اعلیٰ تعلیم دینے کے لیے ہزاروں کوششیں کی جاتی ہیں؛ لیکن ذرا بھی کسی کو یہ فکر نہیں ہوتی کہ بچے کی عقیدہ کی بھی اصلاح ہونی ہے یا نہیں، نتیجتاً وہ بچہ جب شعور کو پہنچتا ہے تو مغربی اور لادینی افکار سے متاثر نظر آتا ہے، اعلیٰ تعلیم کا خمار اس کے سر پر چڑھا ہوتا ہے، ارتقا (Evolution)

اور بگ بینگ (Big Bang) جیسے نظریات (Theories) سے وہ مرعوب ہوتا ہے۔

اور ایک بڑا طبقہ امت کا وہ بھی ہے جو خوب ریاضات وعبادات سرانجام دیتا ہے، صبح شام ذکرواذکار کرتا ہے، نوافل میں راتیں گزارتا ہے؛ لیکن عقیدے میں پختگی نہیں ہوتی، عقیدہ کمزور ہوتا ہے، شکوک وبدعات کا شکار ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں اُس کے تمام افعال واعمال اکارت چلے جاتے ہیں؛ لہٰذا امت کے دردمند اور فکرمند افراد سے گذارش ہے عقیدے کی اصلاح کے لیے جو کام ہورہا ہے اُس کو باقاعدہ منظّم اور تحریکی شکل میں انجام دیا جائے۔

نسلِ نَو کو جو انٹرنیٹ کی عادی بن چکی ہے سوشل میڈیا کے ذریعہ عام کیے جانے والے گمراہ کن نظریات واعتقادات کی خطرناکیوں سے آگاہ کیا جائے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیرِتعلیم مسلم طلبہ اور طالبات کے لیے ایسا نظام قائم کیا جائے جو اُن کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ اُن کے عقیدہ وایمان کی فکر اور تحفظ پر مبنی ہو اور مطلقاً ہر علاقہ میں ایسے دعاۃ کا ایک سلسلہ قائم کیا جائے جو خود بھی عقیدہ کے پختہ ہوں، قلم وقرطاس کے ماہر ہوں اور حکمت ودانائی کے ساتھ اصلاحِ عقیدہ کا یہ اہم فریضہ انجام دے سکیں؛ تاکہ ہر کوئی صحت عقیدہ کی لذت سے لطف اندوز ہو کہ عقیدہ کے بغیر انسان دنیا وآخرت کی بھلائیوں سے محروم ہے ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝﴾ (المائدہ:۵)

❑❖❑